مجلس ادارہ

جلد ۱۷ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۲ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ہندوستان مین مسلمانون کے اوقاف کے تحفظ اور اصلاح کا مسئلہ ہمیشہ سے توجہ کا محتاج تھا، اب حالات نے اس کو اور زیادہ اہم بنا دیا ہے، بہت سے قدیم اوقاف متولیون کی غفلت اور نااہلی کی وجہ سے برباد ہو چکے ہین، پھر بھی کرورون روپیے سالانہ کے اوقاف باقی ہین، مگر بیشتر اوقاف کی حالت نہایت ابتر ہے، اور اُن کا بڑا حصہ متولیون کے ذاتی مصرف مین آتا ہے، کم اوقاف ایسے نکلین گے، جو صحیح مصرف مین صرف ہوتے ہین، بعض صوبون مین اُن کی نگرانی کے لئے جو نیم سرکاری بورڈ قائم ہین اُن سے اُن کی بے عنوانیون کا پورا تدارک نہین ہو سکتا، اس کے لئے زیادہ مکمل نظام کی ضرورت ہے،

(٭)

ہندوستان کے بیشتر اسلامی ادارے، اور مسلمانون کی مذہبی و قومی تحریکین صاحب ثروت مسلمانون کی امداد سے چلتی تھین، جن کی بڑی تعداد پاکستان چلی گئی، جو لوگ باقی رہ گئے ہین، اُن کی مالی حالت خود بگڑ گئی ہے، اور تنہا اُن کی مدد سے کام نہین چل سکتا، اس لیے کم و بیش تمام اسلامی ادارے مالی دشواریون مین مبتلا ہین، اگر اسلامی اوقاف کی حفاظت اور اُن کی اصلاح کا پورا انتظام ہو جائے، تو تنہا اُن کی آمدنی مسلمانون کے جملہ مذہبی و قومی ضروریات کے لئے کافی ہے اور کسی مدد کی ضرورت ہی باقی نہ رہے،

دوسرا مسئلہ نظام قضا کا ہے، اگرچہ برٹش گورنمنٹ کے زمانہ سے ہندوستان کے تمام فرقون کے مذہبی اور رواجی امور و معاملات مین اُن کا پرسنل لا مانا جاتا ہے، مگر مسلمانون کا پرسنل لا جس حد تک عدالتون مین رائج ہے، وہ ناقص ہے، اور اس کا نظام بھی الگ نہین ہے، بلکہ عام حکام جن مین مسلم اور غیر مسلم دونون ہوتے ہین، ان معاملات کا بھی فیصلہ کرتے ہین، مسلمانون کے نکاح طلاق، تفریق، خلع،

مہر اور وقف و وراثت سے متعلق فقہی مسائل اور اون کی باریکیون کو غیر مسلم کیا مسلم حکام بھی نہین سمجھ سکتے، اس لئے وہ فیصلہ مین غلطی کر جاتے ہین، اور بعض معاملات مین مسلمانون کے پرسنل لا اور عام قانون مین تعارض بھی پیدا ہو جاتا ہے، جس سے بڑی دشواریان پیدا ہو جاتی ہین، اور اُس کے بدولت بہت سی زندگیان برباد ہو جاتی ہین، جس کا تجربہ روزانہ ہوتا رہتا ہے،

(٭)

اس کے علاوہ علما کی بڑی جماعت اس قسم کے معاملات کے فیصلہ کے لئے مسلمان حاکم کو ضروری سمجھتی ہے، اس لئے ان غیر مسلم ملکون مین بھی جہان مسلمانون کی قابل لحاظ آبادی ہے، ہر زمانہ مین ان کا نظام قضا الگ رہا ہے، ہندوستان مین ۱۸۵۷ء کے بعد اس کا خاتمہ ہوا، اور اس زمانہ مین مسلمانون مین اتنی سکت باقی نہین تھی، کہ وہ دوبارہ اس کے قیام کی کوشش کرتے، مگر بعد مین وقتاً فوقتاً اسکی تحریک ہوتی رہی، اور بعض جزوی قوانین بھی بنتے رہے لیکن اس کے مستقل نظام کے قیام کی نوبت نہ آسکی،

(٭)

اب مولوی محمد احمد صاحب کاظمی جمعیۃ العلماء کے مشورہ سے اوقاف کے تحفظ و اصلاح، اور نظام قضا کے قیام کے لئے پارلیمنٹ مین بل پیش کرنے والے ہین، یہ دونون بل نہایت ضروری ہین، مگر بعض جماعتون کی جانب سے اس بدگمانی کی بنا پر اس کی مخالفت شروع ہو گئی ہے، کہ جمعیۃ العلماء قانون کے ذریعہ مسلمانون کے اوقاف پر قبضہ کر کے اُن کو اپنے عقائد اور اپنی صوابدید کے مطابق صرف کرنا چاہتی ہے لیکن یہ اندیشہ صحیح نہین ہے دونون بلون کے مسودے شائع ہو چکے ہین ان مین کوئی ایسی چیز نہین ہے جس سے اس قسم کا شبہہ کیا جا سکے جب اغراض وقف مین کسی قسم کی تبدیلی نہین کیجا سکتی ہے اور اس کا جو نظام قائم ہوگا، اس مین ہر عقیدہ اور خیال کے مسلمانون کی نمایندگی ہوگی، تو جمعیۃ العلماء کے قبضہ اور اس کے من مانی تصرفات کا کوئی امکان ہی نہین ہے اور ابھی تو یہ مسودہ بل کی شکل مین ہے اس مین ترمیم ہو سکتی ہے، اور اس قسم کے خطرات کا انسداد کیا جا سکتا ہے مگر محض سوء ظن یا اختلاف عقائد کی بنا پر ایک ضروری اور مفید کام کی مخالفت مناسب نہین ہے اس لئے مسلمانون کے ہر طبقہ کو اس بل کی پوری تائید کرنی چاہئے،

(٭)

مگر جمعیۃ العلماء کے ارکان سے بھی یہ گذارش ہے کہ وہ اپنے کسی طرز عمل سے کسی جماعت کو شکایت اور بدگمانی کا

موقع نہ دین، خود ہماری نگاہ مین بھی یہ چیز کھٹکی کہ قضاۃ کے انتخاب کے لئے جن مدارس کو تسلیم کیا گیا ہو، ان مین دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نام نہین ہو، اور اس کے مقابلہ مین ایسے مدارس تک کے نام موجود ہین، جن کی کوئی حیثیت ہی نہین ہو، اس لئے اگر اہل ندوہ کو اس سے بدگمانی پیدا ہو تو بیجا نہ ہوگی، اس لئے جمعیۃ العلماء کو اس فروگذاشت کی تلافی کرنی چاہئے،

(۰)

صوبہ دلی کی حکومت کا یہ فیصلہ مبارکباد کے قابل ہو کہ اس نے دلی اسمبلی کی کارروائی کی انگریزی اور ہندی کیساتھ اردو مین بھی اجازت دی ہو، اس طرح اس نے ایک حد تک اردو کو علاقائی زبان تسلیم کر لیا، دلی ہی نے اردو زبان کو بنایا تھا، اس لئے اسی پر اس کی حق شناسی اور دستگیری کا فرض بھی تھا، یہ فیصلہ ان صوبون کی حکومتون کے قابل تقلید نمونہ ہو جہان اردو بولی جاتی ہو، دلی کے بعد اردو کا دوسرا مرکز لکھنؤ اور صوبہ متحدہ ہو، کیا اس صوبہ کی حکومت بھی اردو کا حق ادا کریگی، دلی کی حکومت مین بھی اکثریت ہندوؤن ہی کی ہو، اس لئے ان کا یہ فیصلہ ان لوگون کا جواب ہے، جو اردو علاقائی زبان کی تحریک کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہین، اب ان کو چاہئے کہ دلی کی حکومت کو بھی فرقہ پرست اور غدار کا خطاب دین،

(۰۰)

افسوس ہو کہ گذشتہ مہینہ ایک پرانی یادگار شخصیت میر غلام بھیک نیرنگ کا ستہتر سال کی عمر مین انتقال ہوگیا، ان کا ابتدائی تعارف شاعری کے ذریعہ سے ہوا تھا، اور ایک زمانہ مین اقبال کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا تھا، اور شکوہ و جواب شکوہ کی اشاعت کے زمانہ مین نیرنگ کی بعض نظمین بھی شائع ہوئی تھین، جو اس زمانہ مین بہت مقبول ہوئی تھین، مگر وہ بہت جلد یہ کوچہ چھوڑ کر ملک و ملت کی خدمت مین مصروف ہو گئے، ۱۹۲۳ء مین شدھی اور سنگھٹن کے ہنگامہ کے زمانہ مین اس کے مقابلہ کے لئے انجمن تبلیغ الاسلام قائم تھی، جس کا اس زمانہ مین بڑا شہرہ تھا، مگر ادھر عرصہ سے عزلت نشین ہو گئے تھے، اور ان کا نام بہت کم سننے مین آتا تھا، اور پاکستان کے قیام کے بعد تو ان کی یاد بھی دلون سے فراموش ہو چلی تھی کہ پاکستان کے اخبارات سے ان کی وفات کی اطلاع ملی، اللہ تعالیٰ ملک و ملت کے اس دیرینہ خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

مقالات

جنایات بوجہ غفلت

چھٹا باب:- جنایت کا بالاشتراک ارتکاب

پہلی فصل: نیابتی ذمہ داری کا اصول

از ڈاکٹر محمد غوث، ایم اے پی ایچ ڈی،

(۴)

گذشتہ باب کی ابتدا مین اس کی صراحت کی جا چکی ہے کہ مشترکہ جنایت تین طریقون سے صادر ہوتی ہو، اول مشترکہ فعل سے، دوسرے تو تعات سے، تیسرے نیابتی طریقہ سے، ان مین سے پہلے اور دوسرے طریقون کی توضیح ہو چکی ہے، اس باب مین تیسرے طریقہ کی توضیح اور اس فصل مین نیابتی[۱] ذمہ داری کے اصول پر بحث کی جائے گی،

نیابتی ذمہ داری کے متعلق انگریز مقننین کے بیانات

واضح ہو کہ معمولی طور سے کسی خلاف قانون فعل کا وہی شخص ذمہ دار ہوتا ہے جو اس فعل کا مرتکب ہو لیکن قدیم اور عصری توانین کی رو سے ایسی صورتین بھی پیش آتی ہین جن مین نیابتی ذمہ داری کے اصول پر عمل ہوتا ہے،

---

[۱] نیابتی ذمہ داری کے لئے انگریزی مین (Vicarious Liability.) کی اصطلاح مستعمل ہے،

نیابتی ذمہ داری کا مطلب، مختصر تاریخ

نیابتی ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ کسی خلاف قانون فعل کے ارتکاب کے نتائج کی ذمہ داری مرتکب کے بجائے کسی دوسرے شخص پر عائد کی جائے۔

عصر حاضر میں فوجداری نوعیت کی ذمہ داری میں نیابتی ذمہ داری کے اصول پر عمل نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے، تو بہت شاذ اور جرائم خفیف کی صورتوں میں،

لیکن معاشرہ کی ابتدائی حالت میں نیابتی ذمہ داری کا اصول عالمگیر طور سے رائج تھا، مگر یہ اصول عصری اصول معدلت کے خلاف قرار دیا گیا ہے،

خود شریعت موسوی نے بھی نیابتی ذمہ داری کے اصول کو رد کر دیا تھا، اور یہ حکم دیا گیا تھا کہ

"باپوں کو بچوں کے جرم میں قتل نہیں کیا جائے گا، اور نہ بچے اپنے باپوں کے جرم کے لئے قتل کئے جائیں گے، ہر شخص صرف اپنے جرم کے لئے قتل کیا جائے گا"

افلاطون نے بھی یہی اصول قائم کیا تھا،

عصری دیوانی قوانین میں نیابتی ذمہ داری کا اصول دو صورتوں میں تسلیم کیا گیا ہے، ایک یہ کہ آقا اپنے ملازموں کے ان افعال کا ذمہ دار ہے، جو ان سے دوران ملازمت میں صادر ہوئے ہوں، دوسری صورت متوفی کی قائمقامی کی ہے،

آقا کی ذمہ داری کا اصول

دوسری صورت سے یہاں بحث نہیں ہے پہلی صورت کے متعلق ذیل میں صراحت کی جاتی ہے،

بعض ارباب قانون کا خیال ہے کہ ملازم کے افعال کا آقا کو جو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اس کا اصلی ماخذ دراصل غلام کے افعال میں مالک کی ذمہ داری کا اصول ہے لیکن سر جان سامنڈ اور ان کے ہم خیال قانون دانوں کا اصرار ہے کہ حقیقت حال یہ نہیں ہے،

قانون انگلستان میں متاجر کی ذمہ داری کے سلسلہ میں جو اصول قرار پائے ہیں، وہ نسبتہً

زمانہ حال میں طے ہوئے ہیں، ان کی بنیاد اس قانونی قیاس پر ہے کہ کسی ملازم کے ایسے تمام افعال جو اس نے اپنی ملازمت کے دوران میں اپنے آقا کے کاروبار کے سلسلہ میں انجام دئے، وہ آقا کی صریح یا معنوی رضامندی سے انجام پذیر ہوئے ہیں، اس طرح ملازم کے افعال دراصل آقا کے افعال قرار پاتے ہیں، اور ملازم کے افعال کا آقا جائز ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، یہ قانونی قیاس تدریجی طور سے قانون کا ایک قطعی اصول قرار پا گیا،

چنانچہ اس زمانہ میں کوئی آقا اس عذرداری کا مجاز نہیں ہے کہ اس نے ملازم کو افعال متنازعہ کے عمل میں لانے کی اجازت نہیں دی تھی، یا کوئی فعل اس کی صریح ممانعت کے باوجود وقوع میں آیا،

نیابتی ذمہ داری کی معقولیت حسب ذیل امور پر مبنی ہے،

۱- آقا کی صریح اجازت کو ثابت کرنے کے لئے شہادت اور ثبوت مہیا کرنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں، اس بنا پر یہ امر مناسب سمجھا گیا کہ آقا کی اجازت حاصل ہونے کے متعلق ایک قطعی قیاس قائم کر لیا جائے،

۲- آقا عموماً مالدار ہوتا ہے، اور اس میں دیوانی ذمہ داری برداشت کرنے کی اہلیت ہوتی ہے، اور ملازمین عموماً یہ بار برداشت نہیں کر سکتے، اس بنا پر یہ امر قرین انصاف ہے کہ آقا اپنے ملازموں کے افعال کی وجہ سے وقوع میں آئی ہوئی مضرت کے ہرجانہ کا ذمہ دار قرار دیا جائے[۱]

اسلامی اصول

اس بارہ میں اسلامی شریعت کا عمومی کلیہ یہ ہے کہ

لَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْھَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی[۲]

یعنی قرآن مجید کے اس صاف اور صریح حکم کے علاوہ خود شارع علیہ السلام کے اقوال سے بھی

۱؎ یہ کل بیان سر جان سامنڈ کی جوراس پروڈنس سے ماخوذ ہے، ص ۲۳۳، و ص ۳۴۴، سنہ ۱۹۳۰ء ۲؎ قرآن شریف، سورۃ الانعام،

مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے، چنانچہ حجۃ الاسلام[1] کے خطبۃ الحقوق مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

"ہان! مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہان! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہین، اور بیٹے کے جرم کا باپ جواب دہ نہین[2]"

ایک ارشاد یہ بھی ہو کہ لا تؤخذ دن بجریرۃ غیرکم و لا یجنی علیکم الا انفسکم[3]

یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم مین پکڑا نہین جائے گا، ہر شخص اپنے قصور کا آپ ذمہ دار ہے،

اسی بنا پر فقہاء نے قرار دیا ہے کہ ان ضمان الاتلاف یجب علی المتلف دون غیرہ[4]

یعنی کسی اتلاف کے ہرجانہ کو ادا کرنے کی ذمہ داری تلف کرنے والے پر عائد ہوتی ہے، دوسرے شخص پر نہین، اس لحاظ سے آقا اور ملازم کی آزاد اور متمائز حیثیت مین کوئی فرق پیدا نہین ہوتا، آقا اپنے افعال کا ذمہ دار ہے، اور ملازم اپنے افعال کا، البتہ ملازم یا نوکر، یا خادم کی کسی جنایت سے آقا پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہو یا نہین تو اس کے متعلق آیندہ مضمون مین تفصیلی بحث کی جائے گی،

خلاصۂ بیانات

معمولی طور سے کسی خلاف قانون فعل کا وہی شخص ذمہ دار ہے، جو اس فعل کا مرتکب ہو، لیکن قدیم اور عصری قوانین کی رو سے ایسی صورتین بھی پیش آتی ہین کہ جن مین نیابتی ذمہ داری عمل ہوتا ہی معاشرہ کی ابتدائی حالت مین نیابتی ذمہ داری کا اصول عالمگیر طور سے رائج تھا لیکن یہ اصول عصری اصول معدلت کے خلاف ہے، اور عصری اصول معدلت مین اسلامی اور انگلستانی دونون قوانین مین پورا توافق ہے، عصری دیوانی قوانین مین نیابتی ذمہ داری کا اصول جن صورتون مین تسلیم کیا گیا ہے، ان مین ایک صورت یہ ہو کہ آقا اپنے ملازمون کے ان افعال کا ذمہ دار ہو جو ملازمین سے دوران ملازمت مین صادر ہوئے ہون،

---

[1] حضرت ابن عباس حجۃ الوداع کو حجۃ الاسلام فرمایا کرتے تھے [2] مولانا شبلی نعمانی، سیرۃ النبی حصۂ اول مجلد دوم ص ۵۲ [3] ص ۱۵۵ [4] ابوبکر احمد اسمٰعیل، الدیات واحکامہا فی الفقہ والحدیث ص ۰، مطبوعہ ۳۱۳ [5] مبسوط ص ۶۵ جلد ۲۶

دوسری فصل

آقا اور ملازم

اس فصل مین پہلے انگلستان کے قانون کے وہ اصول بیان کیے جائین گے، جو آقا اور ملازم کے بارے مین قرار دیئے گئے ہین،

ملازم کے افعال کے لئے آقا کی ذمہ داری

انگلستان کے قانون کا یہ اصول ہو کہ اگر کوئی ملازم دوران ملازمت مین کسی جنایت کا ارتکاب کرے، تو اس ملازم کا آقا ہر صورت مین ذمہ دار ہوگا[1]،

انگلستان کے قانون مین یہ اصول اس قیاس پر قائم کیا گیا ہے کہ آقا کا کاروبار انجام دینے کے دوران مین غفلت برتی جائے، یا کسی اور جنایت کا ارتکاب کیا جائے، تو یا تو اس فعل کے ارتکاب کی اجازت آقا کی جانب سے اوس کو حاصل ہے، یا کم از کم ایسے ملازم کو مقرر کرنے مین آقا کی جانب سے احتیاط نہین برتی گئی، جس سے نگرانی اور انتظام مین بے احتیاطی عمل مین آئی[2]،

انگریزی اہل قانون نے یہ صراحت ضرور کی ہے، کہ اکثر واقعات سے اس قیاس کی مطابقت نہین ہوتی، لیکن آقا کی غلطی ثابت کرنا اس قدر دشوار ہوتا ہے کہ یہ امر بہتر خیال کیا گیا، کہ اس نوعیت کا قانونی قیاس ہی قائم کر لیا جائے[3]،

آقا کی ذمہ داری قائم ہونے کے لئے دو شرائط ضروری ہین

آقا اور ملازم کے تعلق سے آقا پر ذمہ داری عائد کرنے کے لئے دو شرطون کی موجودگی ضروری ہے،

۱- ایک آقا اور ملازم کے تعلق کا فی نفسہ وجود،

۲- دوسرے یہ کہ ملازم سے جنایت کا ارتکاب ملازمت کے دوران مین ہوا ہو[4]،

---

[1] سالمنڈ لا آف ٹارٹس ص ۱۰۵، ۱۹۲۰ء [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

ملازم کون ہوتا ہے

انگلستان کے قانون کی رو سے ملازم سے مراد وہ شخص ہے، جس کو کسی دوسرے شخص نے اپنا کام کرنے کے لئے اس شرط کے ساتھ مامور کیا ہو کہ وہ شخص مفوضہ کام انجام دینے میں مامور کرنے والے شخص کے حکم اور کامل نگرانی کے تابع ہوگا،[1]

مثلاً زید کا کوچوان اس کا ملازم ہے، اب اگر یہ کوچوان گاڑی چلانے میں کسی کو ٹکر دے تو زید اس کا ذمہ دار ہوگا، اس کے برخلاف زید نے ایک ٹانگہ کرایہ پر لیا، ٹانگہ چلانے والا زید کا ملازم نہیں، اور اسکی کامل نگرانی میں اور اُس کے حکم کے تابع نہیں، بلکہ اُس نے محض زید سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا دینے کا گویا ایک معاہدہ کیا ہے، جس کی تکمیل کا وہ پابند ہے اس لئے اگر ٹانگہ چلانے میں کوئی حادثہ پیش آجائے، تو ٹانگہ چلانے والا ہی ذمہ دار ہوگا، زید پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی،[2]

چند ذیلی امور

یہ ممکن ہے کہ زید بکر کا ملازم ہو، لیکن کسی خاص کام کی انجام دہی کے لئے وہ خالد کا ملازم قرار پائے اور اس کام کو پورا کرنے میں خالد کے حکم کا تابع اور اُس کی نگرانی میں ہو،[3]

اس سلسلہ میں ایک بات خاص طور سے ذہن میں رکھنی چاہئے کہ عموماً آقا اور ملازم کے تعلق کی بنا واجب الادا معاوضہ کے قرارداد پر ہوئے معاہدہ پر ہوتی ہے، اور عموماً یہ تعلق مسلسل ہوتا ہے لیکن یہ امور اصلی اور ضروری نہیں ہیں،[4]

ان کے علاوہ

۱- ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کا ملازم ہو لیکن اس کو دائمی طور پر مامور نہ کیا گیا ہو،

۲- یا کوئی شخص کسی کا ملازم ہو مگر صرف ایک ہی کام کی انجام دہی اور ایک ہی وقت کے لئے

[1] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۱۰۰ نیز انڈرہل، قانون ٹارٹ ترجمہ راے بیجناتھ ص ۵۵ [2] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۳ [3] انڈرہل قانون ٹارٹ ص ۷۵ [4] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۱۱۱

۳- یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی کا ملازم ہو،

۴- یا ایک شخص محض بطور معاوضہ کسی کا ملازم ہو،

غرض ایک شخص کے دوسرے شخص کے پاس ملازم ہونے کا اصلی معیار یہ ہے کہ ملازم پر ملازم رکھنے والے کو حق نگرانی اور اس کو ہدایتیں دینے کا حق اور اختیار حاصل ہو، اگر یہ اختیار موجود ہے تو آقا اور ملازم کا تعلق بھی ثابت ہوتا ہے،[1]

اس تعلق سے چند امور بھی قابلِ توجہ ہیں،

۱- خدمت انجام دلانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آقا جسمانی طور ہی سے نگرانی کرے، بلکہ صرف نگرانی کا حق اور اختیار حاصل ہونے کا ثبوت کافی ہے،

۲- ایک شخص ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ افراد کا ملازم قرار پا سکتا ہے،

۳- کوئی آقا اپنا ملازم کسی دوسرے شخص کو مستعار دے سکتا ہے، اس صورت میں ملازم اس شخص کا ملازم قرار پائے گا، جس نے اوس کو مستعار لیا ہے،

اس سلسلہ میں یہ امر پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس قسم کے استعارہ سے مستعار دینے والے اور مستعار لینے والے کے مابین کیا انتظام عمل میں آیا ہے، اور نگرانی کا حق کس طرح استعمال کیا جاتا ہے، اس اعتبار سے ذمہ داری اس شخص پر عائد ہوگی، جس کے اغراض کے لئے اور جس کی نگرانی میں وہ کام انجام پایا، جس سے شکایت پیدا ہوئی، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ مستعار لینے کی صورت میں بھی ملازم پر نگرانی آقا ہی کی قائم رہے،[2]

ملازم اور خود مختار معاہدلہ میں فرق

ملازم اور خود مختار معاہدلہ[3] میں یہ فرق ہے کہ ملازم آقا کی ہدایت کے ماتحت

[1] یہ بیان ماخوذ ہے سامنڈ کی لا آف ٹارٹس سے ص ۱۱۱ شنہ ۱۹۲۸ء [2] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۱۱۱ و ص ۱۱۲ [3] اس کو انگریزی میں (Independent contractor) کی اصطلاح رائج ہے،

اس کی نگرانی مین کام انجام دیتا ہے، اور خود مختار معاہد لہ پر کوئی نگرانی نہین ہوتی، اور کام کے انجام دینے مین وہ بالکل آزاد ہوتا ہے، اور ملازم کے لئے ہر کام مین اپنے آقا کے حکم کی تعمیل ضروری ہے لیکن خود مختار معاہد لہ صرف کسی خاص کام کے انجام دینے کا پابند ہوتا ہے، اور کام انجام دینے کے طریقہ اور اس کے وقت کے بارہ مین اپنے اختیار تمیزی کو کام مین لاتا ہے، اور اگرچہ وہ معاہدہ کا پابند ہوتا ہے لیکن آجر کے احکام اور اسکی ہدایتون کے بموجب عمل کرنے کا پابند نہین ہوتا[۵۱]،

خود مختار معاہد لہ کے افعال کا آجر ذمہ دار نہین ہوتا، البتہ چند مستثنیات ہین، جن کے متعلق آئندہ صراحت کی جائے گی،

اسلامی فقیہون کی رائین

ان مسائل کے سلسلہ مین قانون انگلستان مین جو امور مقرر ہین، اُن کے بارہ مین اس قدر صراحت کافی ہے، آئندہ اپنے موقع پر مزید وضاحت آئے گی، اب اسلامی فقہ کی جانب رجوع کیا جاتا ہے،

اسلامی فقہ مین ملازم کی تعریف

اسلامی فقہاء نے اجیر کی دو قسمین بیان کی ہین،

(۱) اجیر مشترک (۲) اجیر خاص[۵۲]،

اجیر مشترک کے متعلق صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ وہ اجرت کا اس وقت تک مستحق نہین ہوتا جب تک کام ختم نہ ہوجائے، مثلاً رنگریز، یا دھوبی، اور اجیر مشترک سے جو معاہدہ ہوتا ہے، اس مین مقصود علیہ معاہد لہ کا اثر یا عمل ہوتا ہے، اور وہ اس کا مجاز ہوتا ہے کہ دوسرون کے لئے بھی کام انجام دے، اجیر مشترک سے جو منفعت حاصل ہوتی ہے، وہ کسی ایک فرد کے ساتھ مختص نہین ہوتی[۵۳] اور اجیر خاص سے مراد وہ شخص ہے جو ایک مدت کے لئے اپنی ذات کسی دوسرے شخص کے سپرد کرکے اجرت کا مستحق ہوتا ہے، مثلاً مہینہ بھر خدمت انجام دینے کا معاہدہ کرے،

[۵۱] سامنڈ لا آف ٹارٹس ص ۱۱۰، [۵۲] و [۵۳] ہدایہ ص ۲۹۲ جلدین آخرین ۱۳۰۶ھ،

اجیر خاص کے بارہ مین صاحب ہدایہ نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس کے لئے یہ ممکن نہین ہے کہ متاجر کے علاوہ کسی دوسرے آدمی کا کوئی کام انجام دے سکے، کیونکہ مدت مقررہ کے اندر اجیر کے کام کی منفعت متاجر کے لئے مختص ہوچکی ہے، اور اجرت اس کے بدل کے طور پر ادا کی جاتی ہے[۵۴]،

مجلۃ الاحکام کے اجیر خاص (یا اجیر واحد) اور اجیر مشترک کے بارہ مین مزید صراحت ہوتی ہے، جس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا،

اس کے بیان کے مطابق بھی اجیر کی دو قسمین ہین، ایک اجیر خاص، دوسرے اجیر مشترک، اجیر خاص وہ ہے جو اس امر کا معاہدہ کرتا ہے کہ صرف متاجر کے لئے کام کرے گا، جیسے خادم موظف "موظف" سے مراد ایسا شخص ہے جو ایک ہی کام ہمیشہ کیا کرے،

اجیر مشترک وہ ہے جو کام کرنے مین کسی ایسی شرط کا پابند نہین ہوتا جس کی رو سے متاجر کے علاوہ کسی اور شخص کا کام انجام نہ دے سکے، جیسے حمال، دلال، خیاط، گاڑی بان یا کشتی ران وغیرہ، یہ سب اجیر مشترک ہین، ان مین سے کوئی بھی کسی خاص شخص سے مختص نہین ہوتا، بلکہ اس کو حق حاصل رہتا ہے کہ جو بھی اس سے کام لینا چاہے، اس کا کام وہ انجام دے سکتا ہے،

اگر کوئی شخص کسی اجیر مشترک سے یہ طے کرے کہ ایک وقت معین مین وہ صرف متاجر ہی کا کام انجام دے گا، تو اس مقررہ وقت کے دوران مین اجیر مشترک کی حیثیت اجیر خاص کی ہوجائے گی، مثلاً کسی حمال یا کسی گاڑی بان یا ملاح سے یہ شرط کرلیجائے کہ کسی معین مقام تک پہنچانے مین اجیر متاجر سے ہی مختص رہے گا، اور کسی دوسرے شخص کا کوئی کام انجام نہ دے گا، تو اس صورت مین اُن کی حیثیت اجیر خاص کی ہوجائے گی[۵۵]،

غرض اجیر خاص کو اجرت ملنے کا حق وقت مقررہ کی بنا پر حاصل ہوتا ہے، کام معیار نہین

[۵۴] الہدایہ ص ۲۹۲ جلدین آخرین [۵۵] مجلۃ الاحکام مادہ ۴۲۲ ص ۱۲۱، ۱۲۷،

ہوتا، اس کے لئے یہ امر جائز نہین کہ متاجر کی اجازت کے بغیر کسی اور شخص کا کوئی کام انجام دے،

اُس کے برخلاف اجیر مشترک متاجر کے لئے بھی کام کرسکتا ہے، اور دوسرون کے لئے بھی،[۱۸]

اس اعتبار سے اجیر مشترک کی تعریف یہ ہوئی،

"جو اپنے عمل کی وجہ سے اجرت کا مستحق ہوتا ہے، نہ کہ اپنی ذات کو سپرد کردینے کی وجہ سے"[۱۹]

اور اجیر خاص کی تعریف یہ ہے کہ

"جو اپنی ذات کو کسی خاص مدت کے لئے سپرد کردینے کی بنا پر اجرت کا مستحق ہوتا ہے، خواہ مدت مقررہ مین کوئی کام انجام نہ دے"،[۲۰]

ان تعریفون سے معلوم ہوا کہ قانونِ انگلستان مین انڈی پنڈنٹ کنٹراکٹر سے جو شخصیت مراد لی گئی ہے، اس کے لئے اسلامی قانون مین اجیر مشترک کی اصطلاح ہے اور سرونٹ کی اصطلاح سے جو شخصیت مراد لی جاتی ہے، اس کے لئے اجیر خاص کی اصطلاح ہے،

ملازم کی انگلستانی اور اسلامی تعریف کا فرق

انگلستان کے قانون کی رو سے ملازم کی جو تعریف کی گئی ہے، اور اسلامی فقہاء کی تعریف مین کچھ فرق ضرور ہے، لیکن یہ صرف فرق لفظی ہے، دونون کا مآل ایک ہی ہے۔ قانونِ انگلستان مین ملازم کی تعریف مین آقا کی نگرانی (کنٹرول) کو مدلول بنایا گیا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ آقا کی نگرانی اور اُس کے حکم کا نفاذ اسی وقت ہوتا ہے، جب ملازم کی جانب سے اسلامی فقہاء کے الفاظ مین تسلیم نفس وقوع مین آئے، تسلیم نفس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ملازم پر آقا کی نگرانی قائم ہوگئی اور وہ اُسی کے کنٹرول مین ہوگا، اُس کے بعد ملازم آقا کی اجازت کے بغیر

---

[۱۸] معین الحکام علاء الدین الطرابلسی، ص ۲۳۵، مطبوعہ مصر ۱۳۱۰ھ، [۱۹] مجمع الضمانات ابو محمد غانم البغدادی ص ۲۷، مطبوعہ مصر، [۲۰] مجمع الضمانات متذکرہ تعلیق گذشتہ ص ۲۸، یہ تعریف ہدایہ سے اخذ کی گئی ہے، ملاحظہ ہو، ہدایہ ص ۲۹۴، جلدین آخرین، [۲۱] تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ یہی تعریفین علامہ سرخسی کی کتاب المبسوط

کسی اور کے کنٹرول مین نہین آسکتا، اس بیان کی توضیح ایک مثال سے ہوگی،

ایک متاجر نے ایک چرواہا اس کام پر مقرر کیا کہ وہ متاجر کی بکریون کو ایک درہم کے معاوضہ مین مہینہ بھر چرائے گا، اس صورت مین اجیر کی حیثیت اجیر مشترک کی ہوگی، لیکن اگر متاجر یہ شرط کرے، کہ وہ اس دوران مین کسی دوسرے کی بکریون کو نہ چرائے گا، تو اس صورت مین اجیر کی حیثیت اجیر خاص کی ہوجائے گی،[۱]

اس مثال سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ قانون انگلستان کی تعریف کے بموجب اسلامی قانون کی رو سے بھی اجیر خاص متاجر کے کنٹرول کا تابع ہوتا ہے، اور اوس کی ہدایتون اور حکم کے مطابق عمل کرتا ہے،

معاہدۂ ملازمت کا بدل اسلامی فقہ کی رو سے

اوپر اس کی وضاحت کی جاچکی ہے، کہ انگلستانی قانون کی رو سے آقا اور ملازم کے تعلق کی بنا پر عموماً واجب الادا معاوضہ کے بدل مین قرار پائے ہوئے معاہدہ پر ہوتی ہے، اب اس سلسلہ مین اسلامی فقہ کے احکام کی وضاحت کی جاتی ہے،

اسلامی قانون کے بموجب آقا اور ملازم کا تعلق عقد یا معاہدہ اجارہ کی بنا پر ہوتا ہے، اس پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے،[۲] اور یہ گویا ایک فقہی مقولہ ہی ہے، کہ

"یجوز اجارۃ الآدمی للخدمۃ"[۳]

اجارہ کی تعریف یہ کی گئی ہے، کہ وہ اس عقد (معاہدہ) کا نام ہے، جو کسی عوض کے بدل مین کسی منفعت کے حصول کے لئے کیا جاتا ہے،[۴]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) مین بھی ہین، ص ۱۰۲، جلد ۱۵، [۱] کفایہ تعلیق نمبر ۶، ص ۲۹۴ وہدایہ جلدین آخرین [۲] بدایۃ المجتہد ابن رشد ص ۱۸۴، دوسری جلد مطبوعہ استنبول ۱۳۳۳ھ [۳] مجلۃ الاحکام مادہ ۵۶۲ ص ۸۰ [۴] ہدایہ ص ۲۷۷ جلدین آخرین نیز نہایۃ المحتاج بشرح المنہاج آملی، ص ۱۹۰، جلد ۴،

جنایات

عقد اجارہ کے معقود علیہ (منفعت) کے اعتبار سے اجارہ کی دو قسمیں ہیں،

۱- اعیان سے منفعت حاصل کرنے کے لئے معاہدہ عمل میں آیا ہے، مثلاً مکانات میں رہنے کا معاہدہ،

۲- عمل یا کام سے منفعت اٹھانے کے لئے معاہدہ کیا گیا ہو، مثلاً خدمت انجام دینے کا معاہدہ، جو شخص اپنے عمل سے منفعت پہنچانے کا معاہدہ عمل میں لائے، اس کو اجیر کہا جاتا ہے[۱]

اس تقسیم کی تصدیق صاحب ہدایہ اور دوسرے فقہائے متقدمین کے بیان سے بھی ہوئی ہے، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ عقد اجارہ کسی کام یا عمل کے لئے ہوتا ہے، مثلاً دھوبی یا درزی سے عمل کی انجام دہی کا معاملہ یا منفعت کے حصول کے لئے مثلاً اجیر خاص کی محنت سے استفادہ،[۲]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اجارہ کے لئے خواہ وہ کسی آدمی کی خدمت سے استفادہ کے لئے کیوں نہ ہو بدل کا ہونا ضروری ہے، بعض فقہا نے صراحت سے بھی یہ شرط بیان کر دی ہے کہ عقد اجارہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو، اس وقت تک قابل نفاذ نہیں ہوتا جب تک کہ اجرت مقرر نہ ہو جائے،[۳]

اجرت سے مراد بدل ہے[۴] بلکہ علامہ سرخسی نے تو اجیر خاص کی تعریف ہی میں بدل کو مدلول قرار دیا ہے، انھوں نے اجیر خاص یا اجیر واحد کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ

"الاجیر الواحد ھو الذی یستوجب البدل بمقابلۃ منافعہ"[۶]

دونوں قانونی نظاموں کا اس مسئلہ میں توافق

اسلامی فقہا کے مسلک کی اس صراحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انگلستانی قانون کی طرح اسلامی فقہا بھی آقا اور ملازم کے تعلق کی بنا، واجب الادا معاوضہ کے بدل میں قرار پائے ہوئے معاہدہ کو قرار دیتے ہیں،

[۱] مجلۃ الاحکام مادہ ۴۲۱ ص ۱۰، [۲] ہدایہ ص ۲۷۰ جلدین آخرین [۳] ہدایہ ص ۲۷۰ جلدین آخرین [۴] ایضاً [۵] مجلۃ الاحکام مادہ ۴۰۴ ص ۰۰، [۶] مبسوط جلد ۱۴ ص ۱۰۳

آقا اور ملازم کے تعلق کا تسلسل دونوں نظاموں کا توافق

انگلستانی قانون کی رو سے آقا اور ملازم کا تعلق عموماً مسلسل ہوتا ہے، اس بارے میں اسلامی قانون کو متعین کرنے میں اس بات کو خیال میں رکھنا چاہیے کہ اجیر خاص معاہدہ کی بنا پر مجبور ہوتا ہے کہ صرف مستاجر کے کام انجام دے، یا اُس کی خدمت بجا لائے، اور مقررہ مدت میں اجیر خاص مستاجر کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا، اس سے ثابت ہوا کہ آقا اور ملازم کا تعلق دوران ملازمت میں مسلسل ہوتا ہے، اس طرح اسلامی قانون کی رو سے بھی آقا اور ملازم کا تعلق مسلسل ہونا چاہیے،

چند ذیلی امور میں اسلامی فقہا کا مسلک

اب انگلستان کے قانون کے ذیلی امور کے بارہ میں جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے، اسلامی فقہا کے مسلک کو بیان کیا جاتا ہے،

ملازمت کا دوامی نہ ہونا

(۱) اس بارہ میں کہ ایک شخص دوسرے شخص کا ملازم ہو لیکن اس کو دوامی طور سے مامور نہ کیا گیا ہو، اسلامی فقہا کو کوئی اختلاف نہیں ہے، مجلۃ الاحکام میں تصریح ہے کہ اگر کوئی مستاجر اجیر مشترک کو کسی کام کی انجام دہی کے لیے معین وقت تک کے لیے مامور کرے تو جائز ہے، اس مدت معین کے لیے اجیر مشترک کی حیثیت اجیر خاص کی ہو جائے گی،[۱]

مثلاً کوئی شخص کسی شخص کو صرف ایک مہینہ کے لیے اپنی خدمت کی غرض سے مامور کرے، یا کسی چرواہے کو مقرر کرے کہ وہ ایک مہینہ کے لیے مستاجر کے ریوڑ کو چرائے،[۲]

غرض عقد اجارہ ہر اس مدت کے لیے ہو سکتا ہے جس کے لیے عاقدین رضامند ہو جائیں خواہ یہ مدت کم ہو یا زیادہ،[۳] البتہ جیسا کہ قاضی ابن رشد نے صراحت کی ہے، جمہور فقہا نے بالاتفاق یہ بات ضروری قرار دی ہے کہ مدت مجہول نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کی تعیین ضروری ہے تاکہ کسی فریق کو دھوکہ کا احتمال نہ ہو، اگرچہ علمائے اہل ظاہر نے اس سے اختلاف کیا ہے،[۴]

[۱] ابو محمد غانم البغدادی، مجمع الضمانات ص ۲۸ [۲] المرغینانی ہدایہ ص ۲۷۶ جلد آخرین [۳] بدایۃ المجتہد ص ۱۸۸ جلد ۲

ملازم کے فرائض

۲- انگریزون کے قانون کا ایک اور مسئلہ یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے، کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا ملازم ہو، اور صرف ایک ہی کام کی انجام دہی اور ایک ہی وقت کے لئے مامور کیا گیا ہو،

یہ مسئلہ بھی مسلمان فقہار کے نزدیک مسلم ہے کہ اجیر صرف ایک ہی کام کے لئے مامور کیا جائیگا، مثلاً بکریون کے ریوڑ کو چرانے[1]، یا صرف دکان کی حفاظت کے لئے[2]، یا کسی سامان کے حمل ونقل کے لئے[3]، غرض یہ صورت زیادہ تر عاقدین کے باہمی معاہدہ اور اُن کی صوابدید پر موقوف ہے،

بلا معاوضہ ملازمت

۳- انگلستانی قانون کا ایک قاعدہ یہ بھی بیان ہو چکا ہے، کہ ایک شخص دوسرے شخص کا بلا معاوضہ ملازم بھی ہو سکتا ہے،

یہ صورت زیادہ تر اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی خدمت رضا کارانہ طور پر انجام دے،

لارڈ ہٹشل کے بیان کے مطابق رضا کار وہ ہے، جو معاہدۂ ملازمت کے ماتحت معاوضہ نہ حاصل کرے، لیکن اپنے آپ کو کسی مستاجر کے ماتحت خادم کی حیثیت مین کام کرنے کے لئے پابند کرلے[4]،

اس صورت مین رضا کار جو مستاجر کی رضامندی سے اس کے فائدہ کے لئے کام انجام دیتا ہے، اس کام کے سلسلہ مین مستاجر کا خادم شمار ہوگا، اور اگر کسی تیسرے شخص کو اس رضا کار کی غفلت کی وجہ سے نقصان برداشت کرنا پڑے، تو مستاجر (آقا) ذمہ دار ہوگا[5]،

رضا کارانہ طور سے کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام انجام دینے کی اسلامی قانون مین

---

[1] بموجب تعلیق نمبر ۲ [2] ایضاً [3] مجلۃ الاحکام ص ۲، مادہ ۴۲۲، [4] بی ون ہنگ لی جنس ان لا ص ۸۰، جلد اول، [5] کلرک اینڈ لنڈس لاآف ٹارٹس ص ۹۱، ۱۹۲۱ء،

کوئی ممانعت نہیں ہے کیونکہ تبرع کا اطلاق بہت وسیع ہے، اور رضا کارانہ خدمات پر اس کے اطلاق مین کوئی عذر شرعی نہیں ہو سکتا، اور بلا معاوضہ کام کرنے کی بعض دوسری صورتین اسلامی ارباب قانون نے بیان کی ہین، مثلاً تلمیذ، تلمیذ سے مراد وہ شخص ہے جو کسی کاریگر کے پاس کام سیکھنے کے لئے مقرر ہو، اور دونون مین سے کوئی ایک دوسرے کے لئے اجرت نہ مقرر کرے[1]،

ملازمت کی ایک اور صورت

۴- انگلستان کے قانون کی رو سے یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا ملازم ہو، اگرچہ یہ ملازمت بطور واقعہ نہ ثابت ہو، مثلاً اگر کوئی بچہ اپنے والد کی نیابت مین کسی ملازم کا کام انجام دے، تو بچہ کو بطور واقعہ باپ کا ملازم قرار دیا جائے گا[2]،

اس مسئلہ مین بھی اسلامی فقہار کو کوئی اختلاف نہین ہو سکتا ہے، علامہ سرخسی نے صراحت کی ہے کہ چرواہے کے لئے یہ جائز ہے، کہ وہ بکریون کے ریوڑ کو اپنے غلام، اجیر یا بچہ کے ذریعہ چروائے اُن لوگون کا بکریون کے ریوڑ کی حفاظت کرنا، اور چرانا خود چرواہے کی حفاظت یا چرانے کے برابر ہوگا[3]،

ظاہر ہے کہ اس صورت مین بچہ باپ کے اجیر کی حیثیت سے کام انجام دے رہا ہے، یا بچہ اور اجیر کی ایک ہی حیثیت ہے، یا دوسرے الفاظ مین بچہ کو باپ کا (de facto) خادم قرار دے سکتے ہین،

اب مسائل زیر بحث کے سلسلہ مین تین امور کے متعلق اسلامی ارباب فقہ کا مسلک متعین کرنا ہے،

(۱) ملازم پر آقا کی نگرانی کی کیا نوعیت ہے،

(۲) کوئی شخص ایک ہی وقت مین ایک سے زیادہ افراد کا ملازم ہو سکتا ہے، یا نہین،

(۳) کسی شخص کا دوسرے شخص کو ملازم مستعار دینا جائز نہین یا نہین، اور اس صورت مین ذمہ داری

---

[1] مجلۃ الاحکام ص ۸۰، مادہ ۵۶۹، [2] سامنڈ لاآف ٹارٹس، ص ۱۱۱، [3] مبسوط ص ۱۶۱ جلد ۱۵

کا تعین کس طرح ہو گا،

۱۔ ملازم پر آقا کی نگرانی کی نوعیت،

انگلستانی قانون مین یہ مسلم ہے کہ ملازم پر آقا کی جسمانی نگرانی ضروری نہین ہے[1] اور اس پر کسی خاص بحث کی ضرورت نہین ہے، اس لئے کہ یہ ممکن نہین ہے، کہ کوئی آقا آٹھ پہر مسلسل اپنے خادم کے کام کی نگرانی کرتا رہے، اور جب ایک سے زیادہ ملازم ہون تو ذاتی نگرانی ہر وقت ممکن نہین ہے، پھر جب ملازمین مختلف مقامات پر مختلف امور کی انجام دہی پر مامور ہون تو آقا کی ذاتی اور جسمانی نگرانی محال ہے، اس لئے آقا کے کنٹرول اور اس کی نگرانی کا یہ مفہوم نہین ہو سکتا، کہ آقا درحقیقت ہر وقت کام کا نگران رہے، بلکہ ملازم یا خادم کی جانب سے "تسلیم نفس" کے بعد وہ بطور واقعہ آقا کی نگرانی مین آ گیا، خواہ آقا بذاتہ نگرانی کرے، یا نہ کرے،

۲۔ کسی شخص کا بوقت واحد ایک سے زیادہ افراد کا ملازم ہونا،

انگلستان کے قانون کی رو سے ایک شخص ایک ہی وقت مین ایک سے زیادہ افراد کا ملازم ہو سکتا ہے[2]،

اسلامی فقہاء کے یہان بھی یہ مسئلہ مسلم ہے، چنانچہ مجلۃ الاحکام مین ہے، کہ جس طرح یہ جائز ہے کہ کسی اجیر خاص کا متاجر کوئی شخص واحد ہو، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ متعدد افراد جن پر شخص واحد کا اطلاق ہوتا ہے کسی اجیر خاص کے متاجر ہون، مثلاً کسی قریہ کے باشندون نے مجازی طور پر کسی چرواہے کو ایک ہی معاہدہ کے ذریعہ اپنا اجیر مقرر کیا ہو کہ وہ انہی لوگون کے کام سے مخصوص رہے گا، تو اس صورت مین یہ چرواہا اجیر خاص قرار پائے گا[3]،

ابو محمد بن غانم البغدادی نے بھی لکھا ہو کہ دو یا تین اشخاص کے اجیر خاص کی صورت یہ ہو کہ

---

[1] سامنڈ، لا آف ٹارٹس ص ۱۱۱ سنہ ۱۹۲۶ء [2] بموجب تعلیق نمبر ایک، [3] مجلۃ الاحکام ص ۲، مادہ ۴۲۳،

دو یا تین شخص کسی چرواہے کو ایک ماہ کے لئے اپنی بکریون کو چرانے کے لئے اجیر مقرر کرین[1]،

اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اگر کسی قریہ کے باشندون نے کوئی استاد یا کوئی امام یا مؤذن مامور کیا، اور ان لوگون نے اپنی خدمت ادا کر دی ہو، تو ان کی اجرت اس قریہ کے باشندون سے وصول کی جائے گی[2]،

اس مثال سے بھی یہ اصول مستفاد ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک ہی وقت مین ایک سے زیادہ افراد کا ملازم قرار پا سکتا ہے،

۳۔ ملازم کا اعارہ

انگلستان کے قانون کی رو سے اگر کوئی آقا اپنا ملازم کسی تیسرے شخص کو مستعار دے، تو وہ مستعار لینے والے کا ملازم قرار پائے گا[3]،

یہ مسئلہ متداول فقہی کتابون مین صراحت کے ساتھ نظر سے نہین گذرا لیکن عام فقہی اصول و ضوابط کے ماتحت اس بارے مین فقہی مسلک متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،

اس سلسلہ مین سب سے اول یہ دیکھنا ہے کہ کسی متاجر کو اعارہ یا عاریت کے کا حق حاصل ہے یا نہین، عام طور سے فقہاء نے طے کیا ہو کہ متاجر کو اعارہ کا حق حاصل ہے،

علامہ ابن الشحنہ نے تصریح کی ہے کہ

"المستاجر یعار ویودع ویواجر ویرھن"[4]

اس کا مطلب یہ ہو کہ متاجر عاریت دینے، ودیعت رکھوانے، اجارہ پر دینے اور رہن رکھوانے کا مجاز ہے،

---

[1] مجمع الضمانات ص ۳۰، [2] مجلۃ الاحکام مادہ ۵۰۰، [3] سامنڈ، لا آف ٹارٹس ص ۱۱۱ سنہ ۱۹۲۶ء، [4] لسان الحکام برحاشیہ معین الحکام ص ۶۹،

علامہ ابو غانم بغدادی نے قاضی خان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک چوپایہ اجارہ پر لیا، اور اس پر اس کا قبضہ بھی مکمل ہو گیا، مگر اجارہ کے معاہدہ میں سوار کا تعین نہیں ہوا، تو اس صورت میں مستاجر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چوپایہ کو بھی دے سکتا ہے، عاریت بھی دے سکتا ہے اور کسی کے پاس ودیعت کے طور پر بھی رکھوا سکتا ہے،[1]

اس سے یہ ثابت ہوا کہ مستاجر کو اعارہ کا حق حاصل ہے،

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ مستاجر کو عام طور سے کس قسم کے اشیاء کے اعارہ کا حق پہونچتا ہے، اس کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز قابل اعارہ ہوتی ہے جو انتفاع کے قابل ہو، اسی بنا پر بھاگ جانے والے چوپایہ کا اعارہ جائز نہیں ہے،[2]

اس بیان کی مزید توضیح قاضی ابن رشد کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ اعارہ اراضی، مکانات، چوپایوں اور ہر اس شے میں ہو سکتا ہے، جو بذاتہ موجود ہوں، (ما یعرف بعینہ) صرف شرط یہ ہے کہ اس کی منفعت سے استفادہ مباح ہو،[3]

اس سے ظاہر ہوا کہ اعارہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور ہر ایسی شے کا اعارہ ہو سکتا ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی شرعی ممانعت نہ ہو،

اس طرح پہلے تو یہ ثابت ہوا کہ مستاجر اعارہ کا مجاز ہے، پھر یہ ثابت ہوا کہ اعارہ میں بہت وسعت ہے، اور اگر مستاجر کی جانب سے کوئی اعارہ عمل میں آئے، تو بصورت جواز مستعیر کے لئے اس سے استفادہ مباح ہے، اس لئے اگر مستعیر کسی کام کے لئے مستاجر کی جانب سے اپنے کسی اجیر کا اعارہ وقوع میں آئے، تو اس کی ممانعت کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے،

اعارہ کی صورت میں ملازم کس کا متصور ہوگا — اس سلسلہ میں اب صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ اعارہ

[1] مجمع الضمانات ص ۲۱، [2] مجلۃ الاحکام ص ۲۰، مادہ ۸۰۸، [3] بدایۃ المجتہد ص ۲۶۲ جلد ۲،

کی صورت میں ملازم کس کا متصور ہوگا، مستعیر کا یا معیر کا؟ ایک فقہی کلیہ ہے کہ التابع تابع[4] اس کی رو سے ملازم جس کے پاس کام کر رہا ہوگا، اسی کے پاس ذمہ دار ہوگا، اور اسی کا ملازم متصور ہوگا،

ایک دوسرا فقہی کلیہ یہ ہے کہ الغرم بالغنم[5] اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز سے فائدہ اٹھائے یا منفعت حاصل کرے، اور اس سے کوئی ضرر یا نقصان اٹھانا پڑے تو وہ اسی شخص کو برداشت کرنا ہوگا، اس کلیہ کے موجب بھی ملازم مستعیر کا ہی شمار ہوگا، اور اس کے اعمال کی ذمہ داری بھی مستعیر ہی عائد ہوگی،

خلاصۂ فصل — مذکورۂ بالا مباحث سے آقا اور ملازم کے تعلق کے بارہ میں اسلامی اور انگلستانی قانونی نظاموں میں مندرجۂ ذیل امور میں توافق ثابت ہوتا ہے،

۱- عموماً آقا اور ملازم کے تعلق کی بنا داشتنی معاوضہ کے بدل میں قرار پائے ہوئے معاہدہ پر ہوتی ہے،

۲- یہ تعلق غیر منقطع اور دوامی ہوتا ہے،

۳- ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ملازم ہو لیکن اس کو دوامی طور سے مامور نہ کیا گیا ہو،

۴- کوئی ملازم صرف ایک ہی کام کی انجام دہی کے لئے ایک ہی وقت مامور ہو سکتا ہے،

۵- ملازمت رضا کارانہ اور بلا معاوضہ دونوں طرح ہو سکتی ہے،

۶- ملازمت محض بطور واقعہ ثابت ہو،

۷- خدمت انجام دلانے کے لئے آقا کو جسمانی طور سے ملازم کی نگرانی کرنا ضروری نہیں ہے،

۸- کوئی شخص ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ افراد کا ملازم ہو سکتا ہے،

۹- آقا اپنا ملازم کسی دوسرے شخص کو مستعار دے سکتا ہے،

[4] مجلۃ الاحکام مادہ ۴۷، [5] ایضاً ۸۷،

خلاصۃ الاشعار مؤلفہ تقی الدین محمد کاشی

از

از ڈاکٹر نذیر احمد ایم اے، پی ، ایچ ، ڈی ، ڈی لٹ، لکھنؤ یونیورسٹی

جرمن مستشرق ڈاکٹر ہیرمن ایتھے نے ۱۸۹۶ء کے قریب "نوٹے پرشے لیٹراٹور" (جدید اسلامی دور کا فارسی ادب) مین فارسی نظم کے ماخذون کے سلسلہ مین لکھا تھا کہ اس مضمون پر کوئی ایسی کتاب ابھی تک موجود نہین جسے حقیقی معنون مین فارسی ادب کی تاریخ کہہ سکین مگر متعدد فارسی تذکرون مین ایک ایسی تاریخ کا مواد بہت بڑی مقدار مین موجود ہے، ان تذکرون مین شاعرون کی سوانح عمریان اور ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے، لیکن اکثر تذکرون مین اشعار کا انتخاب نہایت کثرت سے اور حالات زندگی کا حصہ برائے نام ہے، مگر باوجود اس طرح کی کوتاہیون کے ان ماخذون کو فارسی شاعری کی تحقیق و تنقید کا بنیادی پتھر سمجھنا چاہئے، فارسی شعر کی پوری تحقیق ان تصنیفون کے بغیر ناممکن ہے،

اس کے بعد ڈاکٹر ایتھے نے ۴۸ تذکرون کی فہرست تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کی تھی، جس مین پہلا تذکرہ لباب الالباب (۶۰۰-۶۲۵ ہجری) اور آخری ریاض الوفاق (۱۲۲۹ ہجری) ہے، اس فہرست مین آٹھوان تذکرہ خلاصۃ الاشعار ہے جس کا تعارف ذیل کے اوراق مین کرایا جا رہا ہے،

خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار کا مؤلف امیر تقی الدین محمد ابن ... کے مشہور شہر کاشان مین سنہ ۹۴۶ھ

لہ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی صاحب نے اورینٹل کالج میگزین (بابت فروری ۱۹۳۳ء) مین اس مقالے کی پہلی فصل کا ترجمہ چھاپا تھا،

کے قریب پیدا ہوا، اس کے باپ کا نام شرف الدین علی حسینی تھا، تقی الدین نے محتشم کاشانی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور شاعری کے میدان مین قدم رکھا، ذکری تخلص کرتا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس مین اس کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی، بظاہر وہ حسینی سید تھا، اولاً باپ کے نام کے ساتھ یہ نسبت موجود ہے، ثانیاً مآثر رحیمی[1] مین اس کے نام کے ساتھ "سیادت پناہ" کا فقرہ ممکن ہے اسی کی طرف اشارہ ہو، مؤلف اپنی دیانت راست گفتاری مین ضرب المثل تھا اور تذکرۂ مذکور مرتب کرکے اس نے ایسی شہرت حاصل کر لی کہ اس کے نام کے ساتھ "تذکرہ نویس کاشی"[2] کے فقرے شامل کئے جاتے تھے، مؤلف مآثر رحیمی نے (جو نہ صرف اس کا معاصر ہی تھا بلکہ اس سے بہت زیادہ خصوصی تعلقات رکھتا تھا) جب بھی اس کا ذکر کیا ہے ان الفاظ کو خصوصیت کے ساتھ لکھا ہے، تقی الدین محمد معزز گھرانے کا فرد معلوم ہوتا ہے کیونکہ مآثر رحیمی مین اس کو ہمیشہ امیر کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے، اور تذکرہ مکمل کرنے کے بعد تو اس نے ایسی شہرت پائی کہ کاشان کے مخصوصین[3] مین اس کا شمار ہوتا تھا، مؤلف نے طویل عمر پائی تھی، خلاصۃ الاشعار کی تکمیل کے سلسلہ کی آخری تاریخ ۱۰۱۶ھ ملتی ہے، گویا اس تذکرہ کا آخری ایڈیشن مؤلف کی عمر کے سترویں (۷۰) سال مکمل ہوا تھا، اور کتبخانہ بانکی پور کے کیٹلاگر[4] کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ کے بعد بھی اس تذکرہ مین اضافہ و نظر ثانی ہوتی رہی تھی، تقی الدین کی ایک دوسری تصنیف "مآثر الخضریہ" کا ذکر مآثر رحیمی مین کئی بار آیا ہے[5]، یہ کتاب مؤلف مآثر کے برادر بزرگ آقا خضر نہاوندی[6] کے نام پر لکھی گئی تھی، آقائے مذکور ۱۰۱۶ہجری تک کاشان کا نائب حاکم

لہ جلد سوم ص ۱۵۲۷ ہے مثلاً دیکھو مآثر رحیمی جلد ۳ ص ۳۴۳ ، جہان فضلائے کاشان کے ساتھ اس کا نام بھی آیا ہے، سے مثلاً دیکھو فہرست بانکی پور جلد ۸ ص ۲۷-۵ ، جہان خلاصۃ الاشعار کے ایک نسخہ کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، ۷۵ شعرا کے اشعار ۱۰۱۶ھ ہجری کے بعد شامل کئے گئے تھے، ہے جلد ۳ ص ۱۵۲۶، ۱۵۲۹ ہے ۱۰۰۶ھ مین ہجری مین کاشان کا گورنر مقرر ہوا، اور ۱۰۱۶ھ ہجری مین شہید کر ڈالا گیا، دیکھو مآثر جلد ۳ ص ۱۵۳۰-۱۵۴۵،

گوزر رہا، اغلب یہی ہے کہ ۱۰۰۱ھ ہجری کے قریب مآثر الخضریہ مکمل ہوئی،

خلاصۃ الاشعار فارسی شعراء کا عام تذکرہ[1] ہے جس میں ابتدا سے مؤلف کے زمانہ تک کے [illegible] فارسی شعراء کے حالات مع انتخاب کلام درج ہیں، ان کے علاوہ ایک طویل فہرست بطور ضمیمہ ان معاصر شعراء کی ہے، جنھوں نے کتاب کی تکمیل کے وقت اپنے کلام کا نمونہ بھیجا تھا، بانکی پور کے مخطوطہ میں ان تمام شعراء کے علاوہ ۲۵۰ دوسرے شعراء کے کلام کا نمونہ بھی ہے[2]، تذکرۂ مذکور چند اعتبار سے فارسی تذکروں میں سب سے اہم ہے،

(۱) کوئی تذکرہ اتنے اہتمام سے نہیں لکھا گیا، تقی کاشی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسی کتاب کی تیاری میں صرف کیا، ۳۳ سال کی عمر میں اس کی ابتدا کی اور ۳۰ سال تک اس کی تکمیل میں مصروف رہا، بلکہ گمان یہی ہے کہ ۷۰ سال کی عمر کے بعد بھی اس پر نظر ثانی اور اضافہ ہوتا رہا، جس کتاب کی تالیف میں اس قدر محنت و توجہ سے کام لیا گیا ہو اس کا بہت بلند مرتبہ واقع ہونا بعید از قیاس نہیں،

(۲) ایرانی تاریخ میں مولفین و مصنفین کی درایت و دیانت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، لیکن اہل عرب نے اس پر بہت زور دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مورخ یا تذکرہ نویس اگر متدین نہ ہو تو اس کی تاریخ یا تصنیف پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، تقی کاشانی نہایت ثقہ اور معتبر شخص تھا، مولف مآثر رحیمی نے اس کی راست گوئی اور دیانت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے[3]،

"میر تقی الدین محمد تذکرہ نویس کاشی کہ از درست قولان و راست سخنان روزگار و اہل کاشان در ہر باب او را ثقہ می دانستند"

---

[1] عام تذکرے وہ ہیں جن میں فارسی شاعری کے آغاز سے تذکرہ نویس کے زمانہ تک کے شاعروں کا ذکر ہے، خاص تذکرے وہ ہیں جن میں کسی دور کے شاعروں کا حال ہے [2] اسپرنگر نے صرف ۵۰ شعراء کی فہرست دی ہے مگر دیوان ہند نسخہ میں مزید معاصر شعراء کا حال درج ہے [3] مآثر رحیمی جلد ۲ ص ۷۲۳،

ظاہر ہے کہ جب ایسا ثقہ شخص کوئی تذکرہ لکھے گا تو اس تصنیف کا درجہ نہایت ہی ممتاز ہوگا،

(۳) فارسی تذکروں میں خلاصۃ الاشعار سب سے زیادہ ضخیم ہے، اس کی ضخامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انڈیا آفس کا نسخہ[1] (جس میں دو تین جز غائب ہیں) ۱۳۴۲ اوراق پر مشتمل ہے، گویا یہ تذکرہ بڑی تقطیع کے تین ہزار سے زائد صفحات میں پھیلا ہوا ہے،

(۴) کسی تذکرے میں شعراء کے حالات بالعموم اتنے تفصیل سے نہیں پائے جاتے، تقی کاشی نے حالات کے ضمن میں اول تو سنین کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے، دوسرے چند ایسے واقعات بھی لکھا ہے جن سے حالاتِ زندگی کی ترتیب میں بہت آسانی ہوتی ہے اور اس عہد کے شاعرانہ رجحانات کا جابجا ذکر ملتا ہے، مثلاً اس زمانہ کے مناظروں، مشاعروں، شاعرانہ دنگلوں، ہجو نگاریوں کی متعدد مثالیں اس تذکرہ میں ملتی ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ تمام تذکروں میں نہایت ہی ممتاز ہے،

(۵) اشعار کے انتخاب میں مؤلف نے اپنی سخن سنجی اور شعر فہمی کا جس قدر ثبوت دیا ہے، اس کی مثال کوئی دوسرا مولف پیش نہیں کر سکتا، مسٹر اسپرنگر[2] نے اس تذکرہ کی ممتاز خصوصیات بیان کرکے مولف کا مرتبہ تمام فارسی تذکرہ نویسوں میں سب سے بلند ثابت کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"یہ تذکرہ فارسی شعراء کے حالات اور مصنفات و مولفات کی مکمل ترین و مفصل ترین و جامع ترین شرح ہے جو ساتھ ہی بہترین انتخاب اشعار اور نہایت ٹھوس اور بلند تنقیدی اشارات پر مبنی ہے، مصنف نے تمام شعراء کے دیوان کا عمیق مطالعہ کیا اور بکمال احتیاط سے ان کے متعلق ہر قسم کی اطلاعات بہم پہنچاتی ہے"

(۶) اشعار اتنی کثرت سے محفوظ کر دیئے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسری جگہ اتنے اشعار مل سکیں، اس کے علاوہ ہر شاعر کے کلام کا بہترین انتخاب ہے، اس طرح ساڑھے تین لاکھ سے زائد اشعار اس

---

[1] مخطوطہ نمبر ۶۶۷، ص ۳۴۳ [2] بعد فہرست کتب خانہ اودھ ص ۱۴-۱۵،

تذکرہ میں محفوظ ہیں،

(۷) ایسے شعراء کے دیوان کا بیشتر حصہ محفوظ کر دیا ہے جن کا دیوان دستبرد زمانہ سے نہیں بچ سکا، یا جن کا دیوان باقاعدہ مدون نہیں ہوا تھا،

(۸) بہت سے ایسے شعراء کے حالات بھی درج کر دیئے گئے ہیں جن کا نام تو ملتا ہے مگر حالات نہیں ملتے،

(۹) کسی فارسی تذکرہ کی شہرت خود اپنے زمانہ میں اس قدر نہیں ہوئی تھی جس قدر زیر بحث تذکرہ کی اسی کی بدولت مولف کو "تذکرہ نویس کاشی" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا،

(۱۰) عہد صفویہ و مغلیہ ہند کے شعراء کے حالات کے لئے سب سے اہم کتاب ہے، کیونکہ اولاً خود مؤلف نے اس عہد کے سنہرے زمانہ کے تقریباً چالیس[1] سال کے دوران میں اس تذکرہ کو لکھا، ثانیاً معاصرین کے حالات میں نہایت احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے، اسی کے ساتھ تنقیدی نظر ہر ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتی ہوئی ملتی ہے، اور اس عہد کی علمی و ادبی تاریخ کی ترتیب میں اس کتاب سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے، نہ اس کے قبل کے کسی تذکرہ میں اتنی تفصیل ہی ملتی ہے نہ بعد کے تذکروں میں اور نہ اتنی اچھی تنقیدی نظر ہی کسی تذکرہ میں پائی جاتی ہے،

معاصرین کے حالات خاتمہ میں جغرافی ترتیب سے لکھے ہیں، اس سے دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں ایران کے ان تمام علمی مرکزوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے جہاں شعراء حصول کمال کے لئے جمع ہوتے تھے، ان مرکزوں میں کاشان، اصفہان، یزد اور خراسان خاص طور سے اہم تھے، ان کے شعراء، علماء کے مناظروں اور مشاعروں کی جو تفصیل مؤلف نے بہم پہنچائی ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ

له ۹۶۴ھ ہجری سے ۱۰۱۶ھ ہجری تک، یہ زمانہ شاہ طہماسپ کے عہد کے آخری ۲۰ سال اور شاہ عباس کے عہد کے ابتدائی ۲۰ سال کے مطابق ہے،

اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ خصوصیت صرف اس تالیف کے ساتھ خاص ہے، دوسرے تذکروں میں ان چیزوں کا ذکر خال خال ملتا ہے، صرف عرفات العاشقین شاید اس کلیہ سے مستثنیٰ ہو،

تقی الدین محمد نے اول اول ۹۷۸ھ ہجری میں شاہ طہماسپ کے عہد کے آخری سالوں میں خلاصۃ الاشعار کی داغ بیل ڈالی، اور ۷ سال کی مشقت کے بعد ۹۸۵ھ ہجری میں ۴ جلدیں مکمل کر لیں، اور اس کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھا چنانچہ ۸ سال بعد ۹۹۳ھ میں ایک "خاتمہ" کا اضافہ کیا، جس میں معاصر شعراء کے حالات جغرافی ترتیب سے درج کئے، گویا اس طرح ۱۴ سال میں یہ تذکرہ پانچ مجلدات میں تیار ہوا، اس کے ایک دوست نے حسب ذیل قطعہ میں[1] اس کا سالِ تصنیف لکھا ہے،

چون پنج کتاب تقی تذکرہ سنج	در مخزن جلد جا گرفت چون گنج
تا ہر کہ را درست باشد تاریخ	بر پنج کتاب تقی، افزودم "پنج"

"پنج کتاب تقی" سے ۹۸۸ھ ہجری برآمد ہوتے ہیں اس میں ۵ جوڑنے سے ۹۹۳ھ ہجری نکلتے ہیں، اس کے بعد بھی مؤلف نے اضافے اور نظر ثانی کا سلسلہ جاری رکھا، اور ۲۳ سال بعد ۱۰۱۶ھ میں ایک دوسرا ایڈیشن تیار ہوا جو چھ مجلدات پر مشتمل تھا، اس ایڈیشن کا سنہ (۱۰۱۶ ہجری) "ست مجلدات لازم" سے نکلتا ہے، کتاب مذکور کے ورق ۱۱۰۰ ب[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۹۹ھ ہجری میں مؤلف دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف تھا، اس دوسرے ایڈیشن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی قدر اشعار حذف کر دیئے گئے تھے، غالباً اسی درمیان میں مصنف نے ایک اور ایڈیشن تیار کیا تھا جس میں اشعار یک قلم نکال دیئے گئے تھے، اسکی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:-

"جواہر حمد و ثنائے کہ مفرح قلوب اصحاب دین مبین و مفتاح ابواب صدور ارباب یقین" الخ

خلاصۃ الاشعار ایک مقدمہ، چار فصل، چار رکن اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، خاتمہ ۱۲ اصل

له فہرست کتاب خانۂ اودھ ص ۱۴ - ۱۵ ؎ فہرست ایتے ص ۳۴۳، ورق کا شمار دیوان ہند کے نسخے کے مطابق ہے،

مین منقسم ہے جن مین چند دو تین فصل مین تقسیم ہوئی ہین، موٴلف نے اس کو شاہ طہماسپ کے نام پر معنون کیا ہی، گو شاہ مذکور کی وفات تک صرف ۵ سال اس کی ابتدا پر گذرے تھے، اور اس کی وفات کے ایک سال بعد وہ صرف اس کے چار رکن تکمیل کر سکا تھا، اور اس کے بعد تیس اکتیس سال اسی کی تکمیل کے درپے رہا، اور اس طویل مدت مین سے آخری اکیس بیس سال شاہ عباس کے دوران حکومت مین گذرے یعنی یہ تذکرہ مکمل شکل مین شاہ عباس کی حکومت کے بائیسوین سال ظاہر ہوا، لیکن اس نے اس کا انتساب شاہ طہماسپ ہی کے نام سے مناسب خیال کیا،

کتاب کے اجزاء یہ ہین :-

مقدمہ کتاب (۱) ابتدائی حصہ، جو موٴلف کے نام، انتساب، عنوان، کتاب، فہرست اوراق مناجات پر مشتمل ہے، تا ورق ۱۲،

(ب) تذکرہ کی ضرورت " ۱۳،

چار فصل تصوف کے رنگ مین،

(ا) در بیان ایجاد عشق و معرفت ورق ۱۷،

(ب) در تعریف فضیلتِ عشق " ۲۷،

(ج) در تقسیم عشق مجاز و حقیقت و شرائط محبت از جانب محب " ۳۱

(د) در شرائط محبت از طرف محبوب مجازی " ۵۶

اس کے ساتھ سیدنا حضرت علیؑ کے دیوان سے اشعار منتخب ہین، ابتدا اس طرح ہوتی ہے :-

اختیار اشعار حضرت شاہ اولیاء ورق ۶۳

اس کے بعد چار رکن اور ایک خاتمہ ہی،

رکن اول مشتمل بر مجلدات اول و دوم، اس کے ذیل مین ۷۵ قصیدہ گویون کا بیان ہی جو سبکتگین کے زمانہ سے آٹھوین صدی ہجری تک گذرے ہین، مجلد اول مین ۴۴ شاعر ہین، جس مین پہلا ابو القاسم حسین حکیم انوری متوفی ۵۴۵ھ اور آخری قوام الدین احمد گنجوی ہے، مجلد دوم مین ۳۰ شاعر مذکور ہوئے ہین، پہلا شاعر ظہیر فاریابی متوفی ۵۹۸ھ ہجری اور آخری افضل الدین کاشانی متوفی (۶۰۶ھ) ہے،

رکن دوم (مجلد سوم) ۴۲ شاعرون پر مشتمل ہے ان مین بیشتر وہ ہین جنھون نے غزل مین کافی نام پیدا کیا تھا، ان مین پہلا شاعر سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ اور آخری جلال الدین شاہ شجاع کرمانی متوفی ۷۸۶ھ ہی،

رکن سوم (مجلد چہارم) ۴۹ شاعرون پر مشتمل ہے، ان مین بیشتر نوین صدی کے غزل گو شعراء ہین، صرف چند دسوین صدی کے بھی شامل ہین، پہلا شاعر حافظ شیرازی متوفی ۷۹۱ھ اور آخری امیر کمال الدین حسین فانی متوفی ۹۰۶ھ ہی،

رکن چہارم (مجلد پنجم) ان ۱۰۱ شعراء کے حالات پر مشتمل ہے، جو سلطان حسین میرزا کے دور سے موٴلف کے عہد تک گذرے ہین، ان مین پہلا عبد الرحمن جامی متوفی ۸۹۸ھ ہجری، اور آخری غزالی مشہدی ہے،

خاتمہ :- معاصرین کے حالات پر مشتمل ہے، جو ۱۲ اصل مین منقسم ہے، اس حصہ کے بیشتر شعراء سے موٴلف خود ملا تھا، اور بقیہ کے حالات اس کو نہایت مستند ذریعہ سے حاصل ہوئے، تذکرہ کا یہ اہم ترین حصہ ہے، جس کی تکمیل مین ابتداءً تو صرف ۵ سال لگے لیکن بالآخر ۲۴ سال تک مزید اس پر نظر ثانی اور اضافہ ہوتا رہا ہی، اس حصہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے،

"حمد و سپاس بے عدد آفریدگاری را سزد کہ نفس ناطقہ را معدن" الخ

اصل اول کاشان کے شعراء پر مشتمل ہے، یہ دو فصلون مین منقسم ہے فصل اول مین ۳۴ زندہ شاعرون کے حالات بیان ہوئے ہین، یہ حصہ اس مین سب سے اہم ہے، خود مؤلف کاشان ہی کا رہنے والا ہے، اس لئے اس کے بیان کا حرف حرف مستند اور مسلم ہوگا، ان مین پہلا شاعر محتشم کاشانی ہے، جو مؤلف کا استاد بھی تھا، آخری شاعر محمد قاسم سروری ہے فصل دوم مین ۱۸ مرے ہوئے شعراء کا بیان ہے، ان مین پہلا شجاع اور آخری قانعی[51] ہے۔

اصل دوم مین شعرائے اصفہان بیان ہوئے ہین، اس مین بھی دو فصلین ہین فصل اول مین ۲۴ زندہ شاعر مذکور ہین، ان مین پہلا کمال الدین زمیلی اور آخری تکیبی[52] اصفہانی ہے فصل دوم مین[53] ۲۱ مرے ہوئے شاعر بیان ہوئے ہین، جن مین پہلا حرفی، اور آخری میر رمزی ہے،

اصل سوم (شعرائے قم و مضافات) مین ۱۵[54] شعراء مذکور ہین، جن مین پہلا شاعر میر عزیز اللہ صفیری اور آخری وحیدی قمی ہے،

اصل چہارم (شعرائے ساوہ و مضافات) ۱۴ شعراء کے حالات پر مشتمل ہے، جن مین پہلا حزنی اور آخری منصوری ہے،

اصل پنجم (شعرائے قزوین) مین ۲۴[55] شعراء بیان ہوئے ہین، پہلا شاعر سلطان ابراہیم مرزا اور آخری عزیز اللہ ہے،

اصل ششم (شعرائے گیلان) ۱۸ شعراء پر مشتمل ہے، پہلا شاعر خان احمد میرزا، اور آخری محمد

---

[51] اس کے بعد دیوان ہند کے نسخہ مین مولانا عبدی ساکنی (متوفی ۹۷۵ھ) کا ذکر ہے (ورق ۱۰۱۹ب) [52] دیوان ہند کے نسخہ مین مولانا حریفی (متوفی ۹۸۸ھ ہجری) کا ذکر زائد ہے (ورق ۱۰۲۳) [53] دیوان ہند مین ایک شاعر مولانا مشرفی زائد مذکور ہے، (ورق ۱۰۴۰) [54] نسخہ بالا مین ایک شاعر امام قلی بیگ فسونی زیادہ ہے، (ورق ۱۰۹۸)

صوفی آملی ہے،

اصل ہفتم (شعرائے تبریز و آذربائیجان) مین ۴۳ شعراء مذکور ہین، پہلا حقیقی، اور آخری عبدی شیروانی ہے،

اصل ہشتم (شعرائے یزد و کرمان) ۳۰ شعراء پر مشتمل ہے، پہلا شاعر وحشی اور آخری محمد زمان ہے،

اصل نہم (شعرائے شیراز) مین ۴۲ شعراء کے حالات بیان ہوئے ہین، پہلا شرف الدین غیرتی شیرازی اور آخری کاتب شیرازی ہے،

اصل دہم (شعرائے ہمدان) ۱۵[56] شعراء پر مشتمل ہے، جن مین پہلا ہلاکی اور آخری صیقلی بروجردی ہے، اس کے ساتھ تین لاحقے ہین، لاحقہ اول (شعرائے بغداد) مین ۸ شاعر ہین، پہلا شمسی اور آخری تقی ششتری ہے،

لاحقہ دوم مین (شعرائے جربادقان) ۱۰ شاعر ہین، پہلا علی نقی کمرہ، اور آخری وصلی خوانساری ہے،

لاحقہ سوم مین ۱۲ شعرائے خوانسار ہین، جن مین پہلا کمال الدین حسین اور آخری غیاث الدین منصف ہے،

اصل یازدہم شعرائے رے و استراباد و مضافات، دو فصلون مین،

فصل اول (شعرائے رے) ۱۵ شاعر پر مشتمل ہے، جن مین پہلا قاسم بیگ حالتی اور آخری نیلی ہے،

فصل دوم (شعرائے استراباد) ۱۶ شاعرون پر مشتمل ہے، پہلا میر محمد مومن اور آخری میر ہاشم ہے

---

[56] نسخہ بالا مین ایک شاعر میر عاقل بیگ فسونی زیادہ ہے، (ورق ۱۰۰۱)

اصل دوازدہم (شعرائے خراسان وہرات) مین ۹۵[1] شاعرون کے حالات بیان ہوئے ہین جن مین پہلا شاعر میرزا قلی میلی ہروی اور آخری کمال الدین حسین زنیتی مشہدی ہے،

اس پر کتاب ختم ہو جاتی ہے، مگر اس کے بعد ورق ۱۲۶۵ - ۱۳۴۷ تک ان معاصر شعراء کی فہرست ہے جنھون نے تقی کاشی کے پاس اس وقت اپنا کلام بھیجا تھا، جب وہ اپنا تذکرہ مکمل کر چکا تھا، اس لئے ان کا کلام تو اس تذکرے مین شامل نہ ہو سکا، لیکن اُن کے نام کی ایک طویل فہرست تذکرہ مین شامل کرکے ان کو زندۂ جاوید کر دیا، ان مین پہلا شاعر مولانا ابو الحسن ابی وردی ہے،

بانکی پور مین خلاصۃ الاشعار کا رکن سوم (مجلد چہارم) موجود ہے، جو ۲۶۸ ورق پر پھیلا ہوا ہے، اس کے ساتھ ایک ضمیمہ (تذنیب[2]) بھی شامل ہے، جو ۱۲۰ ورق پر مشتمل ہے، اس مین ۲۵۰ قدیم و جدید شعرا کے کلام کا صرف نمونہ درج ہے، یہ ضمیمہ ایک مختصر سے دیباچہ[3] سے شروع ہوتا ہے،

" بر خاطر اذکیاء و اولو الابصار پوشیدہ و مخفی نیست کہ آدمی بہ واسطہ شرافت نطق از ……"

اس دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تکمیل کے بعد مؤلف نے مشہور شعراء کے کلام کا مطالعہ شروع کیا، اور چاہا کہ ان کے حالات درج کئے جائین، لیکن ان کے حالات پرانے تذکرون مین نہ مل سکے، دوسرے یہ تذکرہ چھ مجلدات تک پہنچ چکا تھا، اس لئے اور پھیلانا مناسب نہ معلوم ہوا، مگر ان شعراء کی یاد تازہ رکھنے کے لئے مجلد چہارم کے ساتھ اُن کے اشعار کو شامل کر دیا، ان شعرا کے نام کی ایک فہرست بھی دیدی، ان مین پہلا شاعر علی فتحی اور آخری میر جمال الدین گازرونی ہے،

خلاصۃ الاشعار ابھی تک حلیۂ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا، لیکن اس کے بہت اچھے مخطوطے دنیا

[1] اس مین دو شاعر ایسے درج ہین، جو اسپرنگر نے نہین بیان کئے، مولانا فائضی (ورق ۱۲۵۰) اور خواجہ کمال الدین بن خانفا حسین طالب ورق ۱۲۶۱، [2] اسکے لفظی معنی "دم دار کرنے" کے ہین، [3] فہرست بانکی پور ج ۸ ص ۴۵،

کے مختلف کتب خانون مین محفوظ ہین، اس تذکرہ کے بارے مین ایک عمدہ اور تفصیلی مقالہ مسٹر بلینڈ نے لکھا تھا، جو ایشیاٹک سوسائٹی (لندن) کے جرنل کی نوین جلد[1] مین شائع ہوا تھا، اس کے بعد اسپرنگر نے اس کے دو نسخون[2] کا تعارف کرایا، پہلا نسخہ صرف دو مجلدات یعنی مجلد سوم اور خاتمہ پر مشتمل تھا، اول الذکر ۶۰۰ صفحات پر اور موخر الذکر ۵۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا، دونون حصون کی کتابت سنہ ۱۰۰۴ھ مین (یعنی دوسرے اڈیشن کے ۱۲ سال قبل) ہوئی تھی، دوسرا نسخہ دوسرے اڈیشن کی تلخیص تھا، جس مین اشعار حذف کر دیئے گئے تھے، اسپرنگر کا خیال ہے کہ یہ تلخیص خود مؤلف نے کی تھی، اسپرنگر نے ایک[3] اور نسخہ کا ذکر کیا ہے جو صرف خاتمہ پر مشتمل تھا، یہ مسٹر ہال کی ملک تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا سالِ کتابت وہی تھا جو خاتمہ کی تکمیل کا سنہ ہے، یہی نسخہ اب دیوانِ ہند مین محفوظ ہے،

ولیم پرٹخ (pert - sch) نے برلن کیٹلاگ مین اس کے ایک نسخہ کے ذیل مین خاصی[4] اچھی بحث کی ہے، دیوان ہند مین اس[5] کے دو نسخے ہین، پہلا نسخہ ۲۴۴ اوراق پر مشتمل ہے، جس مین رکن سوم (مجلد چہارم) غائب ہے، اس کی کتابت سنہ ۱۰۳۸ھ مین ہوئی تھی، دوسرا نسخہ خاتمہ کا وہی ہے، جو مسٹر ہال کی ملکیت مین تھا، اس کی کتابت جمادی الثانی سنہ ۹۹۳ ہجری مین عبد الفتاح بن شمس الدین محمد الکاشانی نے کی تھی، یہ ۳۱۰ ورق پر مشتمل ہے، اسپرنگر نے صفحات کی تعداد ۶۲۲ لکھی ہے، ڈاکٹر اتیتے کا خیال ہے کہ اس خاتمہ مین دوسرے اڈیشن کے خاتمہ سے زیادہ اشعار ہین، بہرحال اگرچہ یہ نسخہ کرم خوردہ ہے مگر نہایت درجہ اہم ہے،

ہندوستان مین اس کے تین نسخون کا پتہ چلا ہے، پہلا بانکی پور مین ہے، جس کی اہمیت اس بنا پر بہت زیادہ ہے، کہ بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ خود تقی کاشی یعنی مؤلف تذکرہ کی نظر سے گذرا ہے[6] دوسرا

[1] فہرست کتبخانہ اودھ ص ۱۵، [2] ص ۳ [3] ایضاً، [4] فہرست کتبخانہ دیوان ہند ص ۳۴۳، برلن کیٹلاگ ص ۶۱۰ و بعدہ، [5] فہرست ص ۳۴۳، ۳۴۴، [6] فہرست جلد ۸ ص ۲ و بعدہ،

رام پور مین رضا لائبریری مین ہے، مگر یہ بھی خاتمہ ہی کا نسخہ ہے، اور دوسرے اڈیشن کی نقل ہے، اول اور
آخر سے اس حد تک ناقص ہے، کہ شعرائے کاشان کا ابتدائی ٹکڑا مفقود ہے، اور شعرائے ہرات پر
مشتمل حصہ سرے سے غائب ہے، تیسرا نسخہ کپور تھلہ مین تھا، مگر اب وہ پٹیالہ کے آرکایو مین منتقل ہو چکا ہے
اس مین رکن ثالث کے ۱۰۳ شاعرون اور خاتمہ کی اصل اول کے ۴۹ شاعر مذکور ہین، یہ نسخہ صاف
نستعلیق خط مین ہے، رکن ثالث کے شعراء کے نام درج ہین، لیکن خاتمہ کے شعراء کی جگہ چھوڑ دی
ہوئی ہے، پروفیسر شفیع[1] کی اطلاع کے بموجب کاشان کا پہلا شاعر یعنی محتشم، اس نسخہ مین مذکور تھا،
مگر اصل نسخہ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس مین پہلا شاعر امیر رفیع الدین حیدر معمائی ہے جو درحقیقت
دوسرا شاعر تھا،

یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ باوجود اس قدر اہم ہونے کے یہ تذکرہ اب تک طبع نہ ہو سکا، بظاہر
اس کی ضخامت اسکی اشاعت کی راہ مین حائل رہی ہے ورنہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو ضرور ہی
طبع ہو جانا چاہئے، اس کے پیشتر کے جن سات تذکرون کا ذکر ڈاکٹر ایتھے نے اپنے مقالے مین کیا ہے
ان مین پہلا (لباب الالباب)، دوسرا (تذکرۂ دولت شاہ[2]) چوتھا جواہر الغرائب[3])، پانچوان
(تحفۂ سامی[4]) چھپ چکے ہین، باقی تین تذکرون مین پہلا مجالس النفائس ہے (تصنیف میر شیر علی نوائی)
صرف معاصرین کے حالات پر مشتمل ہے، اور ۸۹۶ ہجری مین چغتائی زبان مین مکمل ہوا، ۹۲۷ ہجری

---

[1] مقدمہ میخانہ (ص لط) [2] لباب الالباب اور تذکرۂ دولت شاہ پروفیسر براؤن کے اعتناء سے
گب میموریل سیریز مین چھپے ہین [3] اسپرنگر نے اس کا نام جواہر الغرائب لکھا ہے (فہرست اودھ ص ۹)
اور اس کے مؤلف یعنی فخری بن امیری کی ایک دوسری تصنیف تحفۃ الحبیب کا بھی تعارف کرایا ہے (ص ۱۱) فخری
وہی ہے جس نے مجالس النفائس کا فارسی مین ترجمہ کیا تھا، یہ کتاب لکھنؤ مین ۱۸۸۶ء مین چھپ گئی ہے [4] اورینٹل کالج
میگزین بابت فروری [illegible] (ص ۲ بعد) [5] اسکی طباعت ایران مین ہوئی ہے،

مین فخری بن امیری نے فارسی کا جامہ پہنایا، اور لطائف نامہ رکھا، دوسرا تذکرۃ الاحباب ہے، جو میر شیر علی
کے وقت سے لیکر ۹۷۴ھ تک کے شعراء کے حالات پر مشتمل ہے (تصنیف نثاری بخاری) تیسرا نفائس المآثر (تصنیف
میرزا علاؤ الدولہ قزوینی کامی) ہے، جو ہندوستان کے ان فارسی شعراء کے حالات پر مشتمل ہے، جو اکبر اور اسکے
متصل پیشروؤن کے عہد مین گذرے ہین، یہ تذکرہ ۹۷۳ اور ۹۸۶ کے درمیان مرتب ہوا، ظاہر ہے کہ
ہندوستان کے لئے یہ تذکرہ بہت ہی اہم ہے، لیکن ہر حیثیت سے خلاصۃ الاشعار سے زیادہ اہم ہے، زیادہ
ضخیم اور مفصل ہونے کے علاوہ اس کے چار مجلدات کامی کے تذکرہ کے ایک سال قبل ہی مکمل ہو چکے تھے[1]، اور
جس پر پورے اکتیس سال تک اضافے ہوتے رہے ہین، خلاصۃ الاشعار کے بعد کے تذکرون مین ہفت اقلیم
(تصنیف امین رازی) کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) نے چھاپ دیا ہے، اور میخانہ (تصنیف عبد النبی)
پروفیسر شفیع کے اعتناء سے حلیۂ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے، مگر خلاصۃ الاشعار کی طرف اب تک کوئی متوجہ
نہین ہوا، اسی عہد کا ایک دوسرا اہم تذکرہ جس کے طبع ہونے کی سخت ضرورت ہے، عرفات العاشقین
(تقی اصفہانی) ہے، کسی دوسری صحبت مین اس کے متعلق تفصیل پیش کی جائے گی، (باقی)

---

[1] چنانچہ اسپرنگر نے فہرست اودھ مین (ص ۴۶) اس کا تعارف خلاصۃ الاشعار کے بعد کرایا ہے،

ایک پرانے مقالہ کی تلاش

نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کے مجموعۂ مضامین کے سلسلہ مین تلاش
آپ کے ایک پرانے مضمون "ریویو بر المامون" کی ہے، جو ۱۸۸۷ء کے آخر یا ۱۸۸۸ء کے شروع مین غالباً ہفتہ وار
آزاد (لکھنؤ) زیر ادارت منشی احمد علی شوق مرحوم مین نکلا تھا، دیسنہ (بہار) کی اردو لائبریری اور محمود آباد راج
کی لائبریری مین اردو کے قدیم رسالون اور پرچون کی فائلین موجود ہین، وہان یا کہین اور اگر ناظرین معارف
کی نظر سے مضمون مذکور گذرے تو وہ براہ کرم مولوی حاجی محمد مقتدی خان شروانی علیگڈھ کو مطلع فرما دین،

"منیجر"

میرزا غازی بیگ ترخانؒ

عہدِ مغلیہ کا ایک مُربّیِ فن و سرپرستِ شعر،

از

از سید اختر مسعود صاحب رضوی ایم اے ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی

شاہانِ مغلیہ کی علم و ادب کی غیر معمولی سرپرستی کے ساتھ ان کے امرا و متوسلین نے بھی شعرا، فضلاء اور ہنرمندوں کی بڑی قدردانی کی اور اس زمانہ کے علوم و فنون کی ترقی میں بہت معین ہوئے،

لہ لفظ ترخان کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ امیر تیمور گورگان اٹھارہ سال کی عمر میں شکار کی دوڑ دھوپ میں راستہ بھول گیا، سخت جاڑوں کی اندھیری رات تھی، تیمور اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ اگر کہیں پناہ نہ ملی تو ہلاکت یقینی ہے اسی فکر اور پریشانی میں ان لوگوں کو ایک جگہ چند خیمے نظر آئے یہ لوگ وہاں پہنچے تو خیمہ والوں نے ان کو ڈاکو سمجھ کر حملہ کر دیا، مگر پھر اصل واقعہ معلوم ہونے کے بعد سب کو اندر لے آئے اور بڑی خاطر و مدارات کی، جب تیمور چونتیس سال کی عمر میں تختِ سلطنت پر بیٹھا تو اس نے اس محسن جماعت کو بلایا، اور ان پر بڑی عنایتیں و مدارات کیں اور ان کو ترخان کا خطاب عطا کیا،

اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ ایک جنگ میں تیمور کی جانب سے یہ جماعت بڑی جانبازی سے لڑی تھی اور خون میں نہا گئی تھی اس کے صلے میں تیمور نے ان کو "ترخون" کا خطاب عطا کیا تھا، جو بعد میں رفتہ رفتہ ترخان ہو گیا، اور یہ لوگ نسلاً بعد نسلٍ اس اعزازی خطاب کو خطاب کے طور پر استعمال کرتے رہے:-

ان امرا میں غازی بیگ ترخان کی حیثیت بہت نمایاں ہے، اس نامور سردار کا تعلق اکبر کے آخری اور جہانگیر کے شروع عہد سے ہے، غازی بیگ ترخان اور اس کے ذوق شعر و ادب کی جانب اب تک کسی نے توجہ نہیں کی ہے، اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ غازی بیگ ترخان اور اس کے کارناموں کا علم دوست اصحاب سے تعارف کرایا جائے،

مرزا غازی بیگ سندھ میں خاندان ترخانیہ کے سلسلہ کی آخری اہم کڑی تھا، یہ مغل نسل سے تھا، اس کا سلسلۂ نسب مشہور مغل بادشاہ ہلاکو سے ملتا ہے، ترخان کا اعزازی خطاب مرزا کے بزرگوں کو ان کی بہادری کے صلے میں امیر تیمور گورگان نے عطا کیا تھا، خاندان ترخانیہ کی بنیاد غازی بیگ کے مورث مرزا عیسٰی ترخان نے سندھ میں ؁۹۶۲ھ میں ڈالی تھی، مرزا عیسٰی نے بچپن سے شاہ بیگ حاکم قندھار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی، اور بعد میں اس کے زمرۂ امراء میں شامل ہو گیا، شاہ بیگ قندھار کا حاکم تھا، جب بابر نے قندھار پر دھاوا کیا تو شاہ بیگ سندھ کی طرف بھاگ گیا، بھکر اور سیوستان پہلے ہی اس کے زیر اثر آ چکے تھے اب اس نے ٹھٹھہ کو بھی مع مضافات کے اپنی مملکتِ سندھ میں شامل کر لیا، شاہ بیگ کے بیٹے شاہ حسن کی موت کے بعد مرزا عیسٰی ترخان مملکتِ سندھ کا حکمران ہوا، اس طرح سندھ میں خاندان ترخانیہ کی بنیاد پڑی، اس نے تقریباً بارہ سال حکومت کی، بھکر (موجودہ سکھر) کے خود مختار حاکم سلطان محمود خان سے مرزا عیسٰی نے دو مرتبہ جنگ کی، دوسری جنگ میں بڑی خون ریزی ہوئی، پہلی جنگ مرزا عیسٰی ترخان کی تخت نشینی کے ایک سال بعد ؁۹۶۳ھ میں ہوئی تھی، اسی جنگ کے سلسلے میں مرزا عیسٰی نے ایک دفد گوا (سبین) بھیجا تھا اور پرتگالیوں

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۸) جن لوگوں کو یہ خطاب ملتا تھا ان کو بعض بہت مخصوص اور اہم مراعات حاصل ہو جاتی تھیں، مثلاً کسی موقع پر کوئی چاوش ان کی روک ٹوک نہیں کر سکتا تھا اور اُن کے اور ان کے لڑکوں کے نو جرم معاف تھے. تحفۃ الکرام مصنفہ امیر علی شیر ص ۵۱،

سے امداد طلب کی تھی، اور پرتگالیون نے اسکی مدد کے لئے سات سو سپاہیون کا ایک دستہ ٹھٹھ بھیجا
تھا، غالباً ہندوستان کی تاریخ مین یہ پہلا موقع تھا جب سندھ مین اہل یورپ کا ذکر آیا ہے، ٹھٹھ
پہنچنے کے بعد پرتگالیون کو معلوم ہوا کہ اب ان کی ضرورت باقی نہین رہی، اور نہ ان کے اخراجات اور
انعام کی ادائگی کی کوئی امید ہے، اس لئے وہ بہت مشتعل ہو گئے اور ٹھٹھ کو خالی پاکر قتل وغارت شروع
کردی، اور اس ہنگامہ مین آٹھ ہزار آدمی کے قریب مارے گئے، اور تقریباً بیس لاکھ اشرفیون کا ساز
وسامان نذر آتش ہو گیا، پرتگالی اپنے ساتھ جتنا سامان لوٹ کرلے گئے اس کے متعلق کہا جاتا ہے
کہ شاید دنیا کے چند ہی بادشاہون کو ایک حملے مین اتنا کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا ہو، شہر کو شعلہ زار
بنانے کے علاوہ پرتگالیون نے دریا کی سطح پر کوئی ایسی دوا چھڑک دی تھی جس سے پانی مین آگ
لگ گئی تھی، اور دریا مین آگ کا ایک سمندر شعلہ زن معلوم ہوتا تھا، اس واقعے کا ذکر کئی مورخون نے
حیرت اور تعجب کے ساتھ کیا ہے، یہ تھا یورپی قوم کے سندھ مین قدم رکھنے کا پہلا نتیجہ! دار الحکومت کی
یہ تباہی سن کر مرزا عیسی فوراً ٹھٹھ واپس آیا مگر یہان پرتگالیون کی بربریت کے دل سوز مناظر کے سوا
اس کو کچھ نہ ملا.

مرزا عیسی ترخان کے دوران حکومت مین محمود خان والی سکھر کے خلاف لڑائیون اور بیٹون
اور دامادون کی آپس کی خانہ جنگیون کے علاوہ کوئی خاص بات نہین ہوئی، اس نے تقریباً بارہ سال
حکومت کی، اس کی شجاعت، مردانگی، حق پرستی، رعایا پروری اور دوسرے صفات کی مورخون نے
بڑی تعریف کی ہے، اس زمانے کی تاریخون سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کی سرکردگی مین مغلیہ
سلطنت کی فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے خود مختار والیان سندھ سخت خوفزدہ رہتے تھے،
سنہ ۹۷۴ھ مین مرزا عیسی ترخان کا انتقال ہو گیا اور سلطنت کی باگ اس کی مرضی کے خلاف اس کے

؎ The Indus Delta Country by Haig PP. 98-99. وتاریخ معصومی ص ۲۰۶،

بڑے بیٹے مرزا محمد باقی ترخان کے ہاتھ مین آئی، یہ شخص بڑا ظالم تھا، ایذا رسانی مین اس کو لذت ملتی
تھی، اس کے انیس سالہ طویل عہد حکومت مین سندھ مین بغاوتون اور خانہ جنگیون کا ایک سلسلہ جاری
رہا، رعایا کا سکون و اطمینان غارت ہو گیا اور مسلسل بدامنی، اور آئے دن کی شورشون سے لوگ اکتا گئے،
یہان تک کہ جب سنہ ۹۹۳ھ مین اس نے اپنے ہاتھ سے پیٹ مین تلوار بھونک کر خودکشی کرلی اس وقت
لوگون نے مدت کے بعد اطمینان کی سانس لی، اس کے بعد مرزا محمد باقی تخت نشین ہوا، اس کے زمانہ مین
مغل فوج نے سکھر کو فتح کرلیا، اس سے مرزا باقی بہت خوفزدہ ہوا، اور اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا
تھا کہ کہین مغل فوج ٹھٹھ پر بھی حملہ آور نہ ہو جائے، اس لئے اس نے مغل دربار سے دوستانہ اور عزیزانہ
تعلقات قائم کرنے کے لئے اپنی لڑکی مغل اعظم کے حرم مین داخل کرنا چاہی، اور بہت سے قیمتی تحائف
اور گران بہا جہیز کے ساتھ ان کو مغل دربار مین بھیجدیا، لیکن شہنشاہ اکبر کو اس لڑکی کا مزاج پسند نہ
آیا، اور یہ ترخانیہ شاہزادی مغل ملکہ کی خواہش دل مین لئے ٹھٹھ واپس آگئی،

مرزا محمد باقی ترخان کے بعد اس کا لڑکا پاینده محمد ترخان تخت کا وارث ہوا، یہ بہت سادہ
لوح، حمیدہ اطوار اور گوشہ نشین فرمانروا تھا، یہان تک کہ اکثر لوگ اس کو مجذوب اور دیوانہ سمجھتے
تھے، یہ نام کا بادشاہ تھا، حکومت کا سارا کام اس کا لڑکا مرزا جانی بیگ ترخان کرتا تھا، یہی مرزا
جانی بیگ مرزا محمد غازی بیگ ترخان کا باپ تھا، چھوٹے بھائی کی معمولی سی بغاوت کے سوا پاینده محمد
کے آٹھ سالہ دور حکومت مین کوئی نمایان واقعہ نہین ہوا،

پاینده محمد کے انتقال کے بعد حکومت کی باگ باضابطہ طور پر مرزا جانی بیگ ترخان کے
ہاتھ مین آگئی، خاندان ترخانیہ کی تاریخ مین جانی بیگ کا دور حکومت خاص اہمیت کا حامل ہے،
اب تک اس خاندان کے بادشاہون کا مرکزی ہندوستان کے انقلابات اور تحریکات سے

؎ ایلیٹ Elliot کی تاریخ ہند، مقتبس از تاریخ طاہری و تاریخ معصومی ص ۱۱۷، ؎ مآثر رحیمی جلد ۲ ص ۳۴۴،

کوئی گہرا تعلق نظر نہیں آتا تھا، اور وہ سندھ میں اپنی مختصر سی دنیا الگ بسائے ہوئے تھے، اور اسی میں مست تھے لیکن جب دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اکبری فتوحات کے سیلاب نے سندھ کا رخ کیا تو مملکتِ ترخانیہ کی انفرادیت تنکے کی طرح بہہ گئی،

سکھر کو مغل فوجوں نے ۹۸۲ھ ہی میں فتح کر لیا تھا، اور اسی وقت سے اکبر کی خواہش تھی کہ خاندان ترخانیہ کے دار السلطنت ٹھٹھ کو بھی فتح اور ترخانی بادشاہ کو گرفتار کر لیا جائے، چنانچہ سکھر میں یکے بعد دیگرے کئی حاکم مقرر کئے گئے مگر کوئی بھی ترخانی سلطنت کو مغلوب نہ کر سکا، اس لئے اکبر کی خواہش فکر سے بدل گئی، کیونکہ اب سلطنت کے وقار کا سوال پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اکبر نے عبد الرحیم خانخانان کو ٹھٹھ کی مہم پر مامور کیا، چنانچہ وہ ۹۹۹ھ میں سکھر پہنچا، ترخانی اور اکبری فوجون میں کئی سخت جنگیں ہوئیں، ترخانی سپاہ بڑی شجاعت اور جانبازی سے لڑی مگر آخر کار ۱۰۰۰ھ میں شکست کھا گئی، اور خان خانان، جانی بیگ کو گرفتار کر کے ۱۰۰۱ھ میں دربار میں حاضر ہوا،[1]

اکبر نے اس مفتوح حکمران کے ساتھ بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا، حالانکہ جب ہمایون پر برا وقت پڑا تھا اور وہ سراسیمہ، بدحال ایران کی طرف بھاگا تھا اس وقت مرزا جانی بیگ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا، مگر اکبر نے اس کے ساتھ بہت شریفانہ سلوک کیا اور سندھ کا علاقہ اس کو واپس کر دیا، مگر سیوستان اور بندر لاہری کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور مرزا کو سہ ہزاری پانصدی منصب سے سرفراز کیا، ان مراعات کے علاوہ ازدواجی تعلق کے ذریعے سے بھی مغلیہ اور ترخانیہ خاندانوں کے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی، چنانچہ جانی بیگ کی ایک لڑکی کی شادی شاہزادہ خسرو شاہ سے اور دوسری کی شادی عبد الرحیم خان خانان کے لڑکے مرزا ایرج بہادر کے ساتھ کر دی گئی، مگر مصالح حکومت کی بنا پر جانی بیگ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور غائبانہ وہ ٹھٹھ

[1] مآثر الامراء جلد سوم ص ۳۰ و دربار اکبری ص ۲۰۰،

جی اپنی کھوئی ہوئی سلطنت میں قدم نہ رکھ سکا، دکن کی مہم میں جانی بیگ بھی اکبر کے ساتھ تھا اور وہیں ماہ رجب ۱۰۰۹ھ میں بمقام برہان پور اس کا انتقال ہو گیا،

مرزا جانی بیگ کے انتقال کے بعد علامی ابو الفضل کی سفارش سے اس کا لڑکا مرزا غازی بیگ ترخان اس کا جانشین اور سندھ کی گورنری پر مامور ہوا، یہی مرزا غازی بیگ ترخان اس مقالے کا موضوع ہے، وہ سلسلۂ ترخانیہ کی آخری اہم کڑی ہے، بعض اہلیتوں اور خصوصیتوں کی بنا پر مرزا غازی اس خاندان کی سب سے اہم اور نمایاں شخصیت تھا،

غازی بیگ کی تاریخ ولادت تاریخوں میں درج نہیں ہے اور اس کی عمر اور تاریخ وفات کے بارہ میں تاریخوں اور تذکروں میں بہت اختلاف ہے، مختلف وجوہ اور قیاسات کی بنا پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، غازی بیگ کا سنہ ولادت ۹۹۶ھ قیاس میں آتا ہے، ۱۰۰۹ھ میں جانی بیگ کے انتقال کے بعد سندھ کا علاقہ غازی بیگ کے ذمے کر دیا گیا تھا، مگر یہ ابھی کمسن اور ناتجربہ کار تھا، اس لئے خسرو خان چرکس کی سرکردگی میں ایک اتالیقی کونسل قائم کر دی گئی تھی، لیکن غازی بیگ تخت پر بیٹھتے ہی پرانے افسروں کو برخاست اور نئے افسروں کو مقرر کرنے لگا، ایک شخص شاہ بازی کو جو اس کے کبوتروں اور کتوں کا نگران تھا، خان کا خطاب عطا کر کے ایک اعلیٰ عہدے پر مامور کر دیا، ان حرکات سے صوبے میں ایک طرح کی بے چینی اور بے اطمینانی پھیل گئی، اور الفخر پور کے حاکم ابو القاسم سلطان نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، مگر غازی بیگ نے اس کو دھوکے سے گرفتار کر کے اندھا کروا دیا، اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد گگرالا کے جام نے اس کے علاقے کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا مگر غازی بیگ نے اس کو فوراً اپنی سرحد سے نکال بھگایا،

۱۰۱۱ھ میں اکبر نے غازی بیگ کو دار السلطنت میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا، طلبی کا فرمان بابا طالب

Progres Report of the Archeaological Sur-vey of Wester India for june 1898.

اصفہانی نے کر گئے، ساتھ ہی سعید خان چغتائی کو جو اس وقت بھکر (موجودہ سکھر) مین تھا، بیس ہزار سوارون
کے ساتھ ٹھٹھ جا کر مرزا غازی بیگ کو لانے کا حکم ہوا، بابا طالب اصفہانی نے ٹھٹھ پہنچکر تحائف شاہانہ کے ساتھ
مرزا غازی کو دار السلطنت چلنے کی دعوت دی، ٹھٹھ کے باہر سعید خان فوج لئے کھڑا تھا اور وہین سے
نوازشات شاہی اور طلبی کے فرمان بھیج رہا تھا، طلبی کے اس انداز سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر
چاہتا تھا کہ پہلے اس کو احسانات سے ٹھٹھ چھوڑنے پر راضی کیا جائے ورنہ پھر زبردستی مجبور کیا جائے،
جہانگیر نے بھی تزک مین لکھا ہے کہ عرش آشیانی نے سعید خان کو حکم دیا کہ دلاسا دیکر اس کو درگاہ
مین لاؤ، صاحب مآثر رحیمی لکھتا ہے:

"باوجود صغر سن وطلب بادشاہ از روے شفقت، چون تکلف وتکلم ظاہری شد سامان
دسر انجام سفر خود را بہانہ ساختہ دران ایام آمدن را موقوف داشت وبعد از دو سال
بہ طور خود بدرگاہ شتافتہ محسود امثال واقران گردید"

اس طرح سفر کی تیاری کا بہانہ کر کے کمسن غازی بیگ نے شہنشاہ اکبر اعظم کے حکم کو ٹال دیا، اور دو سال
بعد اپنی مرضی سے ۱۴ ماہ دسنہ ۱۰۱۳ھ مین آگرہ آیا، یہان اس کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوا، اکبر نے بڑی شفقت
اور مہربانی کا برتاؤ کیا، اور انعام واکرام سے نوازا،

اکبر کی موت کے وقت غازی بیگ آگرے ہی مین تھا، جہانگیر نے تزک مین لکھا ہے کہ میری
تخت نشینی کے وقت مرزا غازی بیگ آگرے مین موجود تھا، خسرو کی بغاوت کے زمانے مین جب
جہانگیر شاہزادے کے تعاقب مین لاہور پہنچا تو وہان یہ خبر ملی کہ سلطنت کی اندرونی سیاسی بے
اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر سرحد خراسان کے قزلباش امراء نے قندھار پر حملہ کر دیا ہے اور قندھا

۱؎ و ۲؎ مآثر رحیمی جلد دوم، ص ۳۵۰، ۳؎ ص ۱۱۰ (جشن ہفتمین نوروز سنہ ۱۰۲۱ھ محرم) ۴؎ جلد ۲ ص ۳۵۰ ۵؎
ص ۱۱۰ (جشن ہفتمین سنہ ۱۰۲۱ھ محرم)

کا حاکم شاہ بیگ قلعے مین محصور کمک کا منتظر ہے، چنانچہ چہار شنبہ محرم سنہ ۱۰۱۵ھ کو جہانگیر نے غازی بیگ
ترخان کی سرداری مین ایک فوج قندھار بھیجی، اسی زمانے مین اس نے غازی بیگ کو پنجہزاری ذات وسوار کا
منصب اور نقارہ مرحمت کیا، پھر شنبہ ۹ ربیع الآخر سنہ ۱۰۱۵ھ کو بیس لاکھ دام نقد عطا کئے، اس فوج کی روانگی
کے بعد جہانگیر نے رجب مین تین ہزار سپاہ پر مشتمل ایک دوسری فوج بھی روانہ کر دی، یہ فوج ۱۲ شوال
سنہ ۱۰۱۵ھ مین قندھار مین داخل ہو گئی، مخالف کی فوج شاہی فوج کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑی ہوئی
اور غازی بیگ نے شاہی حکم کے مطابق سردار خان کو قندھار کا حاکم بنا دیا اور سابق حاکم شاہ بیگ کو
جہانگیر کے پاس روانہ کیا، اس کے بعد خود سندھ کی راہ سے ہفتے کے دن شعبان سنہ ۱۰۱۶ھ کو بادشاہ
کی خدمت مین جو اس زمانے مین لاہور ہی مین تھا حاضر ہو گیا، اس کارگذاری پر جہانگیر مرزا غازی سے
بہت خوش ہوا، تزک مین لکھا ہے کہ "عنایت بسیار بہ او فرمودیم" چنانچہ رمضان سنہ ۱۰۱۶ھ مین مرزا غازی کو
ٹھٹھ کی جائداد کے علاوہ صوبہ ملتان کا بھی کچھ حصہ بطور جاگیر دیا اور قندھار کی حکومت پر سرفراز کر کے
خلعت وشمشیر عنایت کی، مرزا غازی نیا عہدہ سنبھالنے کے لئے پہلے اپنے موروثی علاقے یعنی سندھ گیا،
وہان سے قندھار کے لئے روانہ ہوا، اور اپنی وفات تک اس عہدہ پر رہا، سنہ ۱۰۲۱ھ مین پچیس برس
کے سن مین قندھار مین انتقال کیا،

مرزا غازی کے سبب وفات کے سلسلہ مین مختلف روایات ہین، صاحب مآثر رحیمی
لکھتا ہے کہ

"در قندھار بہ مرض قولنج درگذشت و بہ قول جمعے مسموم گشت"

قاضی محمود ٹھٹھوی کی تاریخ کشتۂ زہر جفا مین اسی زہر دالی روایت کی طرف اشارہ ہے، مآثر الامراء

۱؎ تزک جہانگیری جشن نوروز دوم از جلوس ص ۴۴ ۲؎ ایضاً ص ۴۶ ۳؎ ایضاً جشن ہفتمین نوروز سنہ ۱۰۲۱ھ ۴؎ ایضاً ص ۴۳ ۵؎ ایضاً
ص ۴۷ ۶؎ ایضاً ص ۱۱۰ (جشن ہفتمین نوروز سنہ ۱۰۲۱ھ) ۷؎ جلد ۲ ص ۳۴۵ ۸؎ ایضاً ۹؎ ایضاً

مین ہے کہ:۔

"میرزا ،تشہ،چہار روز بیماری کشیدہ در بست و پنج سالگی فوت کرد، مردم تہمت آن

بر لطف اللہ بہائی خان کہ مصاحب و وکیل میرزا بود و بنا بر ان کہ با پدرش خسرو خان

چرکس مرزا بے عنایتی داشت بستند"

ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ عبد اللطیف نامی ایک غلام نے اس کو زہر دیا تھا، بہرحال

اس کی لاش ٹھٹھ لائی گئی، اور خاندانی قبرستان مین مکلی پہاڑ پر دفن کیا گیا،[۲]

---

[۱] مآثر رحیمی جلد ۲ ص ۲۸۵ [۲] تذکرۂ میخانہ، بہ سلسلہ حواشی ص ۵۰، ممکن ہے مرشد بروجردی کے اس

شعر مین بھی اسی واقعے کی طرف کنایہ ہو،

زہر در ان سوخت در کامش زلال جام را

خون او ترسم بگیرد دامن ایام را

دار المصنفین کی نئی کتاب

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا ترجمہ جس مین مذہب اسلام

اور اسلامی تہذیب و تمدن پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور

مسلمانون کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے ثمرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور

قرون وسطیٰ مین اس کی جہالت اور وحشت و بربریت اور اس دور ترقی مین اس کی پر فریب سیاست کا

پردہ چاک کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین مسلمانون کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آگیا ہے،

(شاہ معین الدین احمد ندوی)

"منیجر"

عندلیب شادانی کی نشاطِ رفتہ

پر

ایک اجمالی نظر

از

پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی، گورنمنٹ کالج، مظفر پور،

"نشاطِ رفتہ" ڈاکٹر عندلیب شادانی (ریڈر شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکہ یونیورسٹی) کا مجموعۂ کلام ہے جو

حال ہی مین بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس مین عموماً منفرد اشعار ہین، چند غزلین بھی ہین،

جو عموماً مسلسل مضامین پر مشتمل ہین، چند نظمین بھی ہین، اور آخر مین چند اشعار ایسے بھی ہین، جو فارسی سے

ماخوذ اور ترجمہ ہین، نشاطِ رفتہ حقیقت مین نشاطِ رفتہ کی درد بھری کہانی ہے، اور یہ بات روشن ہو جاتی ہے

کہ شاعر پر یہ کیفیتین گذری ہین،

دل پر چوٹ پڑی ہے تب تو آہ لبون تک آئی ہے   یونہی چھن سے بول اٹھنا تو شیشہ کا دستور نہین

اس لحاظ سے یہ مجموعۂ کلام حیاتِ معاشقہ کی ایک مکمل ڈائری بھی ہے، شاعر کا عشق بظاہر کامیاب

ہے لیکن اس مین حزن و یاس کا بھی عنصر ہے، اور یہ شعر،

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیان   انھین کی یاد میری زندگی ہے

اس کی پوری شاعری کی تفسیر ہے، اس مین مسرت کے ساتھ یاس بھی ہے، لطف کے ساتھ کرب بھی،

بعض ایسے پہلو بھی ملتے ہین، جہان شباب کے ہر ہوس کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور تخیل کی کارفرمائی کے لئے کوئی

چیز باقی نہین رہ جاتی، مگر یہ سب کیفیتین خواب وخیال ہوکر رہ جاتی ہین، اور گو واقعات ہی سہی، مگر اُن پر کسی رنگین خواب ہی کا گمان ہوتا ہے،

شادانی صاحب رسمی شاعر نہین، وہ بہت پرگو ہین، اور چاہتے تو میر اور مصحفی کی طرح کئی ضخیم دواوین شائع کر سکتے تھے، مگر وہ اپنے قول کے مطابق "برائے بیتی" نہین کہتے، اگر وہ صرف یہی دو چار اشعار کہتے تو اُن کی شاعرانہ عظمت کے لئے کافی ہوتا،

تیرے معصوم تصور سے تو کھیلا ہون ضرور
یہ بھی ہے جرم تو اس جرم سے انکار نہین

عشق سے ہوتا ہے آغازِ حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

کبھی بھی تیر کارگر تھی مگر تری بےحسی کے قربان
نہ آہ پر اب کوئی بھروسا نہ اشک پر اعتماد باقی

مین ہنس دیتا ہون سنکر اپنی خاموشی کی تعبیرین
کوئی مغرور کہتا ہے کوئی دیوانہ کہتا ہے

شکریہ پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہین راز نہ ہو

پھولون کی جو قدر نہ جانے پھول ہون اسکے دامن مین
نکہتِ گل مین جان ہو جس کی جانے نہ پائے گلشن مین

جگر مین ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

شاعر کتنا ہی ہمہ گیر کیون نہ ہو، پھر بھی اس کا تخیل کسی نہ کسی خاص محور پر گردش کرتا رہتا ہے، شادانی کے پورے کلام کی فضا مین چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، چاند سے ان کو خاص لگاؤ ہے، اس لحاظ سے ان کو انگریزی مین (Poet of the moon) کہین گے اور اردو مین ماہتابی شاعر، شعرون سے یہ بات روشن ہو جائے گی

جسم سے جان کھنچی لگتی ہے
چاندنی مین ہے کیا بلا جانے

چاندنی اور اداس تنہائی
تم ہو کس حال مین خدا جانے

نہ چاندنی ہے نہ گرمی کی وہ خنک راتین
تمھاری یاد پھر اس درجہ کیون ستاتی ہے

چاندنی افسردہ، گل بےرنگ، بو، نغمے اداس
اک ترے جانے سے کیا بتلاؤن کیا کیا ہو گیا

تیرے حسن کی تنویر عکس مین کہان پیدا
ماہتاب کی تصویر، چاندنی نہین ہوتی

چاندنی، کاہکشان، پھول، گھٹا، مینہ، نغمے
کیا یہ سب میری تمناؤن کی روداد نہین

چاندنی، موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہین

کیا رہا جب چھن گئی تیرے تبسم کی ضیا
چاندنی راتین بھی اب میرے لئے تاریک ہین

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو
اللہ رے حسنِ ذوق مرے انتخاب کا

تم دور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی
آنکھون سے رات بھر ہم توڑا کئے ستارے

وہ چاندنی مین تیرے تبسم کی کہکشان
کیا ایک بار اور میسر نہ آئے گی

شادانی صاحب کے کلام مین جو اور چیزین نمایان حیثیت رکھتی ہین، وہ حسبِ ذیل ہین،

ندرتِ بیان:-

حسن محوِ خواب تھا شبِ یار کی آغوش مین
بوستان بھر پھول تھے، اور آسمان بھر چاندنی

گریبان مین کچھ اور کچھ پھول بالون مین سجا کر
چمن کو لوٹنے والے گلستان بن کے آئے ہین

تا حدِ نظر اک دیوانہ مڑ مڑ کر تکتا جاتا تھا
اس جانب حسرت سے نگران وہ تھم تھم کر آتے تھے

نادر تشبیہین اور تمثیلین:

آنسو جو ہوئے خشک تو جگنو بن گئین آنکھین
گہوارۂ شبنم مین شرر دیکھ رہا ہون

مین تجھے بھول گیا ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کہین بھولا ہے نشیمن اپنا

کشتی بدر سے چڑھتا ہوا دریا دیکھا
اللہ اللہ وہ عالم تری انگڑائی کا

تیرے حسن کی تنویر عکس مین کہان پیدا
ماہتاب کی تصویر، چاندنی نہین ہوتی

یہ کیفیت سنہری چوڑیون کی خوشنمائی مین
کرن خورشید کی لپٹی ہوئی گویا کلائی مین

پوشیدہ رہ سکا نہ تبسم نقاب میں — تابندہ برق چھپ نہیں سکتی سحاب میں

سوز و گداز :-

نہ پونچھو میرے آنسو بس مجھے یونہی تڑپنے دو — تم اتنے مہربان ہوتے تو دل کا خون کیوں ہوتا

کم ہوتی ہے نہ تڑپ دل کی تھمتے ہیں نہ بہتے آنسو ہی — بجلی ہر کہ چمکے جاتی ہے بادل ہیں کہ برسے جاتے ہیں

زخم دل کے چھپا رہا ہوں میں — کوئی میری ہنسی کو کیا جانے

آہ کی قدر، اشک کی قیمت — کوئی غم ناشناس کیا جانے

اس کو حسن اتفاق کہئے کہ نشاطِ رفتہ کو ابھی دو چار ہی دن ہوئے تھے اور دل پوری طرح اس سے لطف اندوز نہ ہونے پایا تھا کہ مارچ ١٩٥٢ء کے نگار میں جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کی اس پر تنقیدِ نظر سے گذری، اثر صاحب کی بلاغت نظر اور ذوق ادب کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اُن کی نکتہ دانی کا اعتراف سب کو ہے، اور جس جہان بین سے انھوں نے کام لیا ہے، وہ جہان بین مصنف کو سزاوار بھی ہے لیکن جو چیز نمایاں طور پر اثر صاحب کی تنقید میں مجھے کھٹکی، وہ شادانی صاحب کے کلام پر جابجا یا جا و بیجا ان کی اصلاحیں ہیں، غلطی کا واضح کر دینا اور شے ہے، اور اس پر اصلاح دے کر اپنی شاعرانہ عظمت منوانا، اور چیز ہے، یہ بڑی خطرناک قسم کی رسم ہے، جو اثر صاحب قائم کرنا چاہتے ہیں، اگر یہ رسم پھیلی تو لوگ میر اور غالب کے کلام پر بھی اصلاحیں دینا شروع کر دیں گے، کیونکہ وہاں اس کی بہت گنجائش ہے، اور اگر یہ سلسلہ قائم رہا تو اصلاح پر اصلاح ہوتی رہے گی، پھر خدا جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہو گا،

سب سے پہلی چیز، جو اثر صاحب کو کھٹکی، وہ نشاطِ رفتہ میں کاغذ کا اسراف ہے، میرے خیال میں ناشر کے ذوقِ جمال کا کمال ہے، جس نے یہ روپ نکھار دیا، پورے صفحہ کو رطب و یابس کلام سے بھرنے کے بجائے اگر ایک یا دو ہی شعر سے نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دے تو اس میں خرابی کیا ہے، اثر صاحب نے شادانی صاحب کے کلام کے ادوار قائم کرنے میں بھی زیادتی سے کام لیا ہے،

اثر صاحب نے شادانی صاحب کے کلام پر جو زبردست نکتہ چینی کی ہے، اس کی ذمہ داری خود شادانی صاحب پر عائد ہوتی ہے، ع

اے بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست

اور میں بڑی حد تک اثر صاحب کا ہم خیال ہوں وہ ہے شادانی صاحب کا یہ دعویٰ کہ

"زندگی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جس پر آپ بیتی کا اطلاق ہوسکے"،

شعر کا محض آپ بیتی ہی ہونا کوئی کمال نہیں، کمال اس کے جگ بیتی ہونے میں ہے، اس کا عامۃ الورود ہونا، اور اس کی ہمہ گیری ہی اس دلکشی اور رعنائی کا سبب ہو سکتی ہے، اور پڑھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" خارجی اسباب کی ترجمانی اسی لئے مستحسن نہیں کہ اس سے محض ایک شخص واحد کے جذبات یا کیفیات کا اظہار ہوتا ہے، جو ممکن ہے، دوسروں کے لئے اجنبی ہو، اور اپنے اندر کوئی جاذبیت نہ رکھتا ہو،

غزل میں ضمیر مونث کا استعمال مستحسن نہیں، شادانی صاحب اس بدعت کے مرتکب ہوئے لیکن اس پر قائم نہ رہ سکے، جس سے اثر صاحب کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا ہے، اور چٹکیاں لیکر لطف اندوز بھی ہوتے ہیں، شادانی صاحب کی شاعری کو اگر سچی شاعری تسلیم کر لیا جائے، تو اثر صاحب حق بجانب ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس کی تاویل یہ کی جائے، کہ اکثر اشعار صنفِ نازک کی زبان سے ادا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور مخاطب طبقۂ ذکور کا کوئی فرد ہے، کچھ اشعار ایسے بھی ہیں، جن میں جذبۂ نسائیت کارفرما نظر آتا ہے، اور وہ نازک لبوں ہی کے لئے مناسب ہیں، مثلاً،

رات کچھ ایسا تصور نے ترے بیخود کیا — ڈال کر اپنے گلے میں اپنی باہیں چوم لیں

چاندنی اور اداس تنہائی — تم ہو کس حال میں خدا جانے

کوئی کشتوں کو اپنے اتنی جلدی بھول جاتا ہو — ابھی باقی ہے شاید تیرے دامن پر لہو میرا

یہ شعر اگر رئیس المتغزلین (حسرت) کا ہوتا، تو مضائقہ نہ تھا، مگر نشاطِ رفتہ میں ہے، اس لئے واقعیت کا پہلو مدِ نظر رکھتے ہوئے دل یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ مخاطب مرد ہوگا، اور عورت الشاذ یہی ہو،

میں نے مانا تمہیں کچھ مجھ سے سروکار نہ تھا
جاتے جاتے مجھے کیوں تم نے پلٹ کر دیکھا

نہ پونچھو میرے آنسو بس مجھے یونہی تڑپنے دو
تم اتنے مہرباں ہوتے تو دل کا خوں کیوں ہوتا

مری یاد نے چھین لیں تری نیندیں
مرا درد کتنا دل آزار ہوگا،

یہ اشعار بھی جنس لطیف کی زبان پر زیادہ زیب دیتے ہیں،

اثر صاحب نے شادانی صاحب کی بعض نظموں کی دل کھول کر تعریف کی ہے، اور اس کے کچھ اقتباس بھی دیئے ہیں، مگر مجھے اس میں بھی بوئے استہزا آتی ہے، میرا اپنا خیال ہے کہ "نشاطِ رفتہ" میں چند نظمیں ایسی ہیں، جو اس مجموعہ میں نہیں کھپتیں، عید قرباں تو سرے سے اس مجموعہ کے لائق ہی نہ تھی، ان نظموں پر اس وقت سیر حاصل تبصرہ کا موقع نہیں، بعض غزلیں جو مسلسل مضامین پر مشتمل ہیں، وہ البتہ قابلِ توجہ ہیں، مثلاً "نشاطِ رفتہ" کے عنوان سے جو غزل ہے، وہ رعنائی تخیل اور حسنِ بیان کا دلکش امتزاج ہے،

پھر اپنے حال کو ماضی بنا رہا ہوں میں
پھر آستیں میں ستارے چھپا رہا ہوں میں

نظر میں یوں ہیں محبت کی چاندنی راتیں
وہیں سحر جیسے ابھی اٹھ کے آ رہا ہوں میں

وہ باغ میں کوئی گم کرکے ڈھونڈھتا ہے مجھے
وہ جگنوؤں میں چھپا مسکرا رہا ہوں میں

خموش بیٹھ کے پاس اور لے کے ہاتھ میں ہاتھ
نظر سے دل کا فسانہ سنا رہا ہوں میں

ترے لبوں میں ہلاہل تھا یا شراب بتا
ترے لبوں کی قسم لڑکھڑا رہا ہوں میں

کچھ اور بس نہیں کاشانۂ تصور میں
نشاطِ رفتہ کی شمعیں جلا رہا ہوں میں

یا پھر وہ غزل جس کا عنوان "زندگی" ہو سکتا ہے، اس کے اشعار سنیئے:-

خلش ہو درد ہو، کاہش ہو کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے،

جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے،

جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے یہ کوئی زندگی ہے،

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے،

اثر صاحب کو نشاطِ رفتہ میں زبان و بیان کی خامیاں اور تخیل کی کمزوریاں بھی نظر آئی ہیں، جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے، شادانی صاحب کا ایک شعر ہے،

سنا ہو تم نے شاید میرے ہمسایوں میں چرچا ہے
کہ اکثر رات کو رونے کی اک آواز آتی ہے،

مضمون لاکھ پامال سہی، مگر اس میں کنایہ کی ایک جدت ضرور ہے، ضیا عظیم آبادی کا یہ شعر ناظرین نے سنا ہوگا،

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں اٹھتا ہے،
ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے،

یا خاقانی کا یہ شعر:

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت
خاقانی را دگر شب آمد،

یا فریاد کا یہ شعر:

ہمسایہ ز نالیدن من نالد و گوید
این نالہ چہ دارد کہ شنیدن نتوانم

لیکن جو کنایہ شادانی صاحب کے شعر میں ہے، اس سے یہ سب اشعار خالی ہیں، اب اس شعر کی داد اثر صاحب کی زبان سے سنیئے، وہ کہتے ہیں،

"اس سے قطع نظر کہ مضمون پامال و فرسودہ ہے، کون باور کرے گا، کہ ڈاکٹر صاحب راتوں کو اس شور سے روتے تھے، کہ ہمسایوں کی نیند حرام ہی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس

گریہ شبگیر کا اس قدر چرچا تھا کہ معشوق کو بھی اطلاع ہونا ممکن ہو گیا"

میرے خیال میں جو مفہوم اثر صاحب نے لیا ہے، کم از کم شعر کے الفاظ سے مترشح نہیں ہوتا، رونے میں نہ شور ہے نہ ہنگامہ ہے بلکہ اک آواز آتی ہے "میں کتنی ترمی ہے، ہمسایوں میں کانوں کان خبر ہوتی ہے، اس کا چرچا ہوتا ہے، اس لئے شاید کا لفظ بھی کتنا بلیغ رکھا ہے، غالباً اثر صاحب کے دماغ میں میر کا یہ پر شور شعر گونج رہا ہوگا،

جو اس شور سے میر روتا رہے گا   تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

کنایہ کی ایک اور عمدہ مثال شادانی صاحب کے اس شعر میں ہے،

آہیں بپا ہے کس لئے؟ سینہ میں کیا آزار ہے   بس کچھ نہ پوچھ اے ہمنشیں اس گھر میں اک بیمار ہے

اثر صاحب کے فریدا اعتراضات کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں، میں غالب کے ایک مصرعہ کا پہلا ٹکڑا "تو نہیں پڑھتا، مگر دوسرا ٹکڑا کہہ دینے میں کوئی تامل نہیں کہ ہم ...... غالب کے طرفدار نہیں" اسی جذبہ کی روشنی میں جا و بیجا اعتراض کی چھان بین کی جائے گی،

شعر: حسن حجاب کوش فریب نظر سہی   رعنائی خیال کا سامان ہو گیا

اعتراض: حسن جو پردہ میں رہنا چاہتا ہے وہ فریب نظر کیسے ہوگا، جھلک دیکھ لیجئے تو دیکھ لیجئے،

میرا یہ خیال ہے کہ وہی جھلک ہی تو فریب نظر کا باعث ہے، جس سے رعنائی خیال کا سامان ہو گیا، ورنہ خیال حقیقت نہ بن جاتا،

شعر: نیم نگاہ دے گئی دل کو فریب التفات   نقش امید ابھر گیا، صبر کا حوصلہ ہوا

اعتراض: صحیح زبان نقش امید ابھرا، ہو گی، اور اس کے بعد حسب عادت اصلاح دی ہے کہ ع

آس بندھی خلش مٹی، صبر کا حوصلہ ہوا

میرے خیال میں "دے گئی" کی مناسبت سے "ابھر گیا" بہتر ہے، اس کی اصلاح کی ضرورت نہیں،

میں جب یہ سوچتا ہوں کہ تم سے جدا ہوں میں   پہروں یہ سوچتا ہوں کہ کیا سوچتا ہوں میں

اعتراض :- سوچنا اور سوچنے کے درمیان یہ سوچنا کہ کیا سوچتا ہوں نفسیات کے کسی اصول سے مطابق نہیں"

تعجب ہے کہ ایک اچھے شعر کو ہدف اعتراض بنایا جائے، خوبی تو اسی میں ہے کہ عاشق کو خود ہی یہ سوجھ ہوتی ہے کہ میں یہ کیا سوچ رہا ہوں کہ تم سے جدا ہوں، تم سے اور جدائی؟

یاد آتی ہے، جو مرحوم تمناؤں کی   بھول جاتا ہوں کہ محروم تمنا ہوں میں

اعتراض: مرحوم تمناؤں کی جگہ خون گشتہ تمناؤں بہتر ہوتا،

میرے خیال میں دونوں مساوی ہیں، مرحوم اور محروم میں جو لطیف تجنیس ہے اس سے بھی یہ شعر محروم ہو جائے گا،

مایوس تمنا کی اللہ رے بیتابی   رونے سے بھی اب دل کو تسکین نہیں ہوتی

اعتراض: عالم یاس میں بے تابی کہاں؟ مایوس کی جگہ برباد پڑھیے،

بیشک برباد مایوس سے بہتر ہے، مگر یہ کہنا کہ عالم یاس میں بیتابی کہاں؟ محل نظر ہے، بیتابی میں اگر گھبراہٹ بھی شامل ہے تو داغ کا یہ شعر سنیئے،

عالم یاس میں گھبرائے نہ انسان بہت   دل سلامت ہے تو حسرت بہت ارمان بہت

نہ سنو قصہ ناکام محبت نہ سنو   ہے وہ خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں

اعتراض: دونوں مصرعے نامربوط، ناکامی محبت کو قصہ کہکر خواب کہنا غلط اور جب خواب نہیں تو تعبیر کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا،

میرے خیال میں اعتراض صحیح نہیں ہے، کسی ناکام محبت کا قصہ ایسا ہی ہے، جیسے کوئی خواب جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو،

کاش مجھے بیدرد سمجھکر مجھ سے انھیں نفرت ہوجائے — ان کا اندوہ ناکامی اور بھی کھائے جاتا ہے

اعتراض: معشوق کو اندوہ ناکامی سے متہم کرنا حد درجہ ابتذال ہے، اصلاح یہ دی ہے کہ

ع "اُن کے نازک دل کا دکھنا اور بھی کھائے جاتا ہے"

اس شعر کو ابتذال سے منسوب کرنا خود اپنے تخیل کی بے راہ روی ہے، عاشق کو یہ گوارا نہین کہ معشوق اس کا غم کھائے اس لئے وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ میری ذات سے اس کو نفرت ہوجائے تاکہ اس کو سکون ہو،

ترے لطف بیکران نے مجھے عمر بھر رُلایا — کہون کس طرح کہ مین نے صلۂ وفا نہ پایا

اعتراض: اس کو حقیقی شاعری سے کوئی لگاؤ نہین، معشوق کے لطف بیکران نے رُلایا کیون؟ پھر اُسی کو آپ صلۂ وفا سمجھتے ہین، وغیرہ وغیرہ،

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ صلۂ وفا ملا اور خوب ملا، اسی کا تو رونا ہے، کاش تو بے وفا ہوتا، لطف بیکران نہ کرتا، تو پھر یہ اذیت کیون ہوتی، شادانی صاحب کے ایک دوسرے شعر سے اس کی وضاحت ہوجائے گی،

رات اک بزم مین تھے جور و جفا کے شکوے — دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

حُسن کی تحلیل ممکن ہو تو بتلاؤن تجھے — ہم نشین وہ کچھ ادائین تھین جو دل کو بھا گئین

اعتراض: "کچھ ادائین" کی جگہ "کیا ادائین" ہونا چاہئے،

اعتراض اس لئے غلط ہے کہ شاعر خود کہتا ہے کہ کون سی ادائین تھین جو بھا گئین اس کا بتانا اسی وقت ممکن ہے جب حسن کی تحلیل کی جائے یعنی اس کا تجزیہ کیا جائے، نیاز صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ تحلیل بمعنی تجزیہ (Analysis.) غلط ہے، جو یقینی صحیح ہے، یعنی نیاز صاحب کا یہ اعتراض صحیح ہے اگرچہ عام طور پر اب قواعد کی کتابون مین (Analysis) اور (Parsing)

کے لئے تحلیل صرفی اور نحوی کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے،

آرزو مین چند کلیان تھین کہ جو مرجھا گئین

اعتراض: "کہ جو" زائد ہے، اور اصلاح یہ دی ہے "آرزو مین چند کلیان تھین کھلیں، مرجھا گئین"

جواب یہ ہے کہ جو یقیناً سماعت پر بار ہے، مگر عام طور پر مستعمل بھی ہے، میر، جرات، آتش، غالب، خواجہ وزیر، مجروح، رضا علی وحشت، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، بیخود دہلوی، کون ہین کہ "جو" اس سے بچے ہوئے ہین، بیچارے شادانی صاحب نے کیا قصور کیا ہے،

یہ جان اس نگہ التفات پر قربان — کہ جس سے دل کی تمنا امید بنتی ہے

اعتراض: "یہ جان" کا ٹکڑا خلاف روزمرہ و محاورہ ہے، میرے خیال مین بھی "یہ جان" بالکل بے جان ہے، آثر صاحب نے یون اصلاح دی ہے:-

"نگاہ ناز کے اس التفات کے قربان"

جو زیادہ فصیح ہے،

آرزو بنتے ہی امید کفن پوش ہوئی — ایسے بے وقت کی اللہ کہین شام نہ ہو

اعتراض: شام تنہائی نہین جو بے وقت کی ہو، اور بے وقت کو "نا وقت" بتایا ہے،

وہ چاہے بے وقت ہو یا نا وقت دونون غیر مستحسن ہین، میرے خیال مین یہ شعر ہی کچھ اچھا نہین معلوم ہوتا،

یکسان موسم یکسان راتین یکسان باد و باران ہین — سونے والے سوتے ہین اور رونے والے روتے ہین

اعتراض: مطلع سے الگ دونون مصرعون مین ردیف کی تکرار معیوب ہے، پہلے مصرعہ مین "ہین" کی جگہ "تھی" چاہئے،

اعتراض صحیح ہے لفظ "بھی" سے زور بیان بھی بڑھ جاتا ہے،

میرا ہنسنا میرا کب ہے ماتگے کا اک گہنا ہے   جس کو اپنا حال چھپانے والے پہنے ہوتے ہیں

اعتراض: محاورہ "مانگے کا گہنا ہے" نہ کہ "اک گہنا" دوسرے گہنا عورتوں سے مخصوص ہے، مرد نہیں پہنتے، اس کے علاوہ اس کے ہنسنے کو گہنا کہنا پھر اس کو پہننا بے جا تصنع اور تکلف ہے،

اعتراض حق بجانب ہے،

کیا گردن میں جو درسعیِ طلب باز نہ ہو   ڈر ہے کچھ اور گمان دلشکنِ ناز نہ ہو

اعتراض "درسعی طلب" مہمل فقرہ ہے، دوسرا مصرعہ بھی مہمل ہے، کون گمان دلشکن ناز ہوگا اسکی طرف کوئی اشارہ نہیں، ناز کی دلشکنی بھی غلط، "ناز" پر کوئی بات گران ہو سکتی ہے، ناز خفا ہو سکتا ہے ناز کی دلشکنی میں غرابت ہے"،

میں بھی اس گتھی کے سلجھانے سے دریغ کرتا ہوں،

ع نہ نشہ وفور انبساط کی ترنگ ہے "نہ" کی جگہ یقینی "یہ" ہونا چاہئے، اور یہ کتابت کی غلطی ہے نکہ شاعر کی، اثر صاحب کو اتنا بھی بدگمان نہ ہونا چاہئے، اس کتاب میں کتابت کی اور بھی غلطیاں ہیں، دیکھیے ص ۲۲۵ "ہمیں" بجائے "صحیتں" ص ۲۶۰ میں "بن نہ جائے" کی جگہ "نہ بن جائے"،

ع یاد آگیا دورہ شباب"

اعتراض: "دورہ بمعنی دور یا زمانہ سند کا محتاج ہے، نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ عربی میں دور یا دورہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، جیسے انگریزی میں Revolution یا Turn کے معنی زمانہ کے ہیں دوران مستعمل ہے، نہ کہ دور یا دورہ، اب اس پر مزید ردّ و قدح ڈالنے کی گنجائش نہیں،

"خاموشی برجبہو پاشی"

اعتراض: "اس کی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی" میرے خیال میں کتابت کی غلطی ہوگی،

ع سادہ بیاضِ گردن ایک خندۂ سحر ہے،

اعتراض: سادہ بیاضِ گردن کو خندۂ سحر سے تشبیہ دینا تخیل کی بے راہ روی ہے، خندۂ سحر سے شگفتگی اور رنگینی کا خیال علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، گردن میں صرف سپیدی ہوتی ہے جسے ان کیفیتوں سے کوئی ربط نہیں، لہذا سحر کے ساتھ کسی متناسب صفت کا اضافہ کرنا چاہئے تھا مثلاً "سادہ بیاضِ گردن اک سیمگون سحر ہے"، اس اعتراض پر نیاز صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ گردن میں صرف سپیدی ہی نہیں، رنگینی بھی ہوتی ہے، لیکن سادہ یقیناً زائد ہے، صرف بیاض گردن کہنا کافی تھا، میرے نزدیک بیاض گردن کو خندۂ سحر سے تشبیہ دینا اگر تخیل کی بے راہ روی ہے، تو آتش بھی اس کے مجرم تھے، انھوں نے کہا ہے،

بیاضِ گردنِ جانان کو صبح کہتے جو ہم   ستارۂ سحری تکمۂ گلو کرتے،

رہا لفظ "سادہ" تو یہ ایک سادہ لفظ ہے، رنگینی کے ساتھ اس کا امتزاج محل نظر نہیں، اقبال اور حسرت دونوں نے کہا ہے کہ

اقبال: غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم   نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

حسرت: پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین   یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

ع ستمہائے "نا" تنہا باکار کر رہی ہوں"

اعتراض: "باکار کا تنہا استعمال اردو میں غیر فصیح ہے" بیکار اگر فصیح ہے تو باکار غیر فصیح کیوں ہو، کثرت استعمال سے یہ بھی ویسا ہی باکار ہو جائے گا جیسے بیکار،

تو نے سر خم کر دیا یا خود قضارا ہو گیا،

اعتراض: خود قضارا مہمل فقرہ ہے، اعتراض درست ہے،

(باقی)

چکبستؔ لکھنوی [۱]

از

جناب پنڈت کشن پرشاد کول لکھنؤ

اردو علم و ادب کے جدید دور مین حالی نے نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی اور چکبست، حسرت، اور اقبال نے اسے پروان چڑھایا، انھون نے محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی فرسودہ داستانون سے دامن بچا کر اس مین جذبۂ قومی اور حب وطن کے پھول بوٹے کھلائے، اور نئی زندگی کے کرشمون کو اجاگر کیا ہے آج کی بات چیت مین صرف چکبست کا تذکرہ کرون گا، اب سے پیشتر اردو شاعری کے صاحب ذوق شائقین اور اس کے کھوٹے اور کھرے کے پرکھنے والون نے چکبست پر کافی لکھا ہے اور جدید دور کے شعراء مین ان کا مقام قائم کرکے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہین، مین آج ان سب کو دہرانا نہین چاہتا، مین صرف ان کی غیر معمولی شخصیت کے نسبت کچھ کہنا اور ان کی اور اپنی صحبتون کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہون،

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء مین بمقام فیض آباد پیدا ہوئے، مگر چند سال بعد ہی لکھنؤ چلے آئے، آپ کشمیری پنڈتون کے ایک پرانے خاندان مین پیدا ہوئے، اردو، فارسی کی تعلیم گھر پر پائی، اور ۱۹۰۵ء مین کیننگ کالج لکھنؤ سے بی، اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۰۸ء مین قانون کا امتحان

[۱] یہ مضمون ۱۴ ستمبر ۱۹۵۲ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر کیا گیا،

پاس کیا، اسی سال وکالت شروع کر دی، پیشہ مین ان کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلون مین تھا، ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء مین ایک مقدمہ مین رائے بریلی تشریف لے گئے، عدالت مین بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کی غرض سے اسٹیشن پر آئے، ریل مین بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی، ہمراہیون نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اتار کر ویٹنگ روم مین لٹا دیا، ڈاکٹر آئے، علاج ہوا مگر سب بے سود، ۷ بجے شام کو اسٹیشن پر ہی انتقال کیا، اور آپ کے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست سابق ایگزیکٹو افسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو لاش موٹر پر رکھ کر لکھنؤ لے آئے،

چکبست نہایت ذکی اور ذہین تھے فیض قدرت سے دماغ روشن اور دل دردمند پایا تھا، ۹ برس کی عمر مین شعر کہنا شروع کیا اور ۲۵ سال کی عمر مین اردو کے شعراء کی صف اول مین نظر آئے، جدید دور مین ان کا نام اقبال اور حسرت کے ساتھ لیا جاتا ہے ۱۹۰۸ء مین وکالت شروع کی اور ۱۹۲۵ء مین لکھنؤ کے سربرآوردہ وکلا مین ان کا شمار ہوتا تھا، پرانے زمانہ کی بہترین شرافت اور شائستگی سے ان کی ہستی کا خمیر گندھا تھا، تکلفات زندگی کی نگاہ مین قدر و قیمت تھی، وضع قطع نہایت صاف ستھری اور چہرہ سے متانت و وقار کا نور ٹپکتا تھا، خوش رو اور خوش خلق جوان تھے، پرانی تہذیب کے حسن اخلاق اور معیار انسانیت کا بہت اچھا اور اعلیٰ نمونہ تھے لیکن نئی تعلیم اور نئے تمدن نے بھی دماغ پر جلا کی تھی، مل، مارلے اور برک کے فلسفہ اور راناڈے اور گوکھلے کی تعلیم و تلقین سے فیض حاصل کیا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ پرانی تہذیب جو کچھ بچ سکتا ہے پوری طرح سمیٹ لینا چاہیے، لیکن نئی روشنی اور نئے تمدن کے سامنے بھی آنکھین بند نہین کرنا چاہئین، ہماری زندگی شرق اور مغرب دونون کی روشنی کا عکس ہونا چاہیے، قدامت پرستی اگر ہمارے اعضاء کو شل کرتی ہے تو نئی تہذیب کی نقالی بھی ہم کو مہذب انسان نہین بنا سکتی، چکبست کا دماغی

توازن قابلِ رشک تھا، ان کی نظر اونچی تھی، ان کو کبھی کسی نے اوچھی اور پوچ باتیں کرتے نہیں سنا، قہقہہ لگاتے ان کو کسی نے مشکل سے دیکھا ہوگا لیکن زیرِ لب تبسم ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، ظاہرا کم گو اور خشک مزاج آدمی معلوم ہوتے تھے، اور یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ شاعر بھی ہو سکتے ہیں مگر برابر والے ہم جلیسوں میں اور یہ حلقہ بہت محدود تھا، ان کی گفتگو نہایت شگفتہ اور ندانی طبیعت خوش کرنے والا ہوتا تھا،

پنڈت بشن نراین در مرحوم سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور ان کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے، پنڈت منوہر لال زتشی، گنگا پرشاد ورما، اور سرتیج بہادر سپرو سے ان کے قریبی اور برادرانہ تعلقات تھے ان سے ان کا ویسا ہی اخلاص تھا کہ جیسا ایک چھوٹے بھائی کا بڑے بھائیوں سے ہوا کرتا ہے، پنڈت بشن نراین در کی ذات سے جو عقیدت انھیں تھی، اس کا بیان "صبحِ وطن" کی پہلی نظم "نذرانۂ روح" میں یوں کیا ہے، ے

میرے سودائے طبیعت کا جو افسانہ ہے — مرنے والے یہ تری روح کا نذرانہ ہے

اور پھر کہتے ہیں :-

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا — حسرت آباد جہان سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس ایک رہبرِ کامل پایا — زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا

لیکے دنیا سے یہی مہرِ وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

یوں تو چالیس سال سے زائد ہوئے کہ جب مجھے سنہ ۱۹۱۰ء میں پہلے پہل لکھنؤ سے واسطہ پڑا، مگر مستقل سکونت یہاں میں نے سنہ ۱۹۱۴ء سے اختیار کی، میں نے اس وقت دائرۂ صحافت میں قدم رکھا تھا، اور بابو گنگا پرشاد ورما مرحوم کے اخبار ہندوستانی کا میں ایڈیٹر تھا، یہی زمانہ چکبست

کی وکالت کے شروع اور ان کی شاعری اور ادبی مشغولیت کے شباب کا تھا، معرکۂ شرر و چکبست نے اس وقت ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے تھے، طبیعتوں کی یکسانی اور ادبی مشغلوں کی دلچسپیوں نے کچھ ایسی صورت پیدا کر دی کہ میرا اور چکبست کا روزمرہ کا ملنا جلنا تھا، بجز ان دنوں کے جب وہ پیشہ کی مصروفیتوں کی وجہ سے لکھنؤ کے باہر ہوتے تھے یا میں کانگریس وغیرہ کے کاموں سے دورہ پر جاتا تھا، تقریباً کامل بارہ برس یعنی ان کے مرنے کے دن تک روزانہ شام کو ملنا جلنا ہوتا تھا، کبھی وہ کچہری سے لوٹتے ہوئے میرے یہاں آتے تھے، پہلے چائے کا شغل اور بعد میں ادبی اور سیاسی تذکرے رہتے تھے، زیادہ تر شام کو میں بھی ان کے یہاں جاتا تھا، میری پہلی تالیف یعنی گلدستۂ پنج کا دیباچہ انھوں نے ہی لکھا تھا، ان کے مجموعۂ کلام یعنی "صبحِ وطن" کا پہلا ایڈیشن میرے ہی زیر اہتمام ہندوستانی پریس میں شایع ہوا تھا، سال میں دو ایک مرتبہ چکبست کے مکان پر وہ اس زمانہ میں گولہ گنج میں اسی مکان میں رہتے تھے جس میں فی زمانہ جسٹس نصر اللہ بیگ رہتے ہیں، مشاعرے ضرور ہوتے تھے، میں نے لکھنؤ کی ان صحبتوں کا لطف ان ہی کے توسل اور ان ہی کے ساتھ اٹھایا، صفی، محشر، ظریف، عزیز، مرزا محمد ہادی رسوا، پنڈت بشن نراین در، آمیر اور دولہا صاحب کو پہلے پہل دیکھنے اور سننے کا اتفاق ان ہی مشاعروں میں ہوا، دولہا صاحب شہنشاہ حسین رضوی مرحوم کے دولت کدہ پر محرم کے ایام میں ہر سال اپنا مرثیہ پڑھا کرتے تھے، چکبست ہر سال دولہا صاحب کا مرثیہ سننے جاتے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ یوں تو کبھی کبھار وہ ہندوستانی میں بھی مضامین شائع ہونے کیلئے بھیجا کرتے تھے، لیکن جب صبحِ امید کا اجرا ہوا تو اس شرط پر کہ چکبست اس کے ایڈیٹر ہوں گے اور ایڈیٹوریل ان ہی کے قلم کے لکھے ہوئے ہوں گے، گو پیشے کی روز افزوں مشغولیت کیوجہ سے انھیں فرصت کم ہوتی تھی اور ایڈیٹوریل کے دیر کر لکھے جانے کیوجہ سے پرچہ نکلنے میں تاخیر ہوتی تھی لیکن جبتک پرچہ نکلا ایڈیٹوریل برابر انھوں نے ہی لکھے، ان میں سیاسی نکات کے علاوہ ادبی چاشنی بھی

ہوتی تھی جسکی وجہ سے "صبح امید" نے شہرت پائی،

چکبست اپنے دور کے صف اول کے شاعر ہی نہ تھے بلکہ اونچے پایہ کے انشا پرداز اور تنقید نگار بھی تھے، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور محاورون پر انھین قدرت حاصل تھی، مباحثہ گلزار نسیم یعنی معرکۂ شرر و چکبست کے سلسلہ مین ان کا جو مضمون "اردوے معلی" مین شایع ہوا تھا وہ صحیح تنقید کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، ہمارے پرانے علم ادب مین تقریظین اور تنقیصین لکھنے کا تو عام دستور تھا، لیکن فن تنقید سے ہمارے بزرگ بالکل ناواقف تھے، اردو مین فن تنقید نے پچاس برس سے زیادہ نہین ہوئے کہ جنم لیا اور پچھلے ۲۰ سال مین نئے ادب کے لکھنے والون نے بعض اچھے اچھے تنقید نگار پیدا کئے ہین جو اب نشو و نما پا رہے ہین، چالیس سال پہلے کے دو ہی مضمون یاد ہین ایسے باقی ہین کہ جو اپنے طرز کی اعلیٰ تنقید کا نمونہ کہے جا سکتے ہین پہلا مضمون سرشار پر پنڈت بشن نرائن در کے قلم سے انگریزی مین سنہ ۱۹۰۴ء مین ہندوستان ریویو مین شایع ہوا تھا، اور اب ان کی تقریرون اور تحریرون کے مجموعہ مین محفوظ ہے، دوسرا قابل داد مضمون چکبست کے قلم سے "داغ" پر رسالہ زمانہ کے جون سنہ ۱۹۰۶ء کے نمبر مین شایع ہوا، اور اب مضامین چکبست کی جلد مین شامل ہے، کم سے کم میری نظر مین تو یہی دو مضمون اس زمانہ کے ایسے ہین جو صحیح اور اعلیٰ تنقید کی بہترین مثالین پیش کرتے ہین، اور جن سے آج بھی ہمارے نوجوان تنقید نگار کچھ حاصل کر سکتے ہین،

چکبست کی نظم "رامائن کا ایک سین" جب شائع ہوئی تو بہت مقبول و مشہور ہوئی ان کے احباب کا تقاضا تھا کہ اس سلسلہ کی اور کڑیون کو جوڑ کر وہ اسے تکمیل کر دین وہ ہان ہان تو کہتے رہے، لیکن پیشہ کی روز افزون مصروفیتون نے کام پورا نہ ہونے دیا، ۱۰ فروری سنہ ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ وہ کچہری سے واپسی مین میرے یہان آئے، چائے کا شغل ہو رہا تھا کہ مجھے کچھ دھیان

آیا تو مین نے پوچھا کہ وہ رامائن کب مکمل ہوگی؟ کہنے لگے کہ چاہتا تو بہت ہون پر وقت کم ملتا ہے، کچھ تو لکھ لیا ہے کچھ باقی ہے مگر جو کچھ لکھا ہے وہ پرچون اور پرزون پر لکھا ہوا ہے سوچ رہا ہون کہ اگر کوئی شخص مل جائے تو اُسے ترتیب دیکر صاف کرا لون، یہ کہہ کر بولے کہ اچھا سنو اس کے تین سین تمھین سناتا ہون اور اپنے خاص انداز مین انھون نے وہ تینون سین زبانی سنائے، پہلا سین رامچندر جی کے بن باس ہونے پر جو اجودھیا نگری کی حالت ہوئی اس کے نسبت تھا، دوسرے سین مین راون کی soliloquy تھی یعنی لڑائی سے قبل جو جذبات و خیالات اس کے دل و دماغ مین موجزن ہو رہے تھے اس کا عکس اتارا تھا تیسرا سین خود لڑائی کے متعلق تھا، یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ یہ تینون سین رامائن کے اُس سین سے جو شایع ہو چکا ہے کسی حالت مین کمتر نہ تھے، چکبست کی شاعری کے تمام جوہر ان نظمون مین جھلکتے تھے، میرے یہان سے اٹھ کر ہم ان کے گھر پہنچے، ۷ بجے شام تک بات چیت اور مذاق ہوتا رہا، رخصت ہونے پر کہنے لگے کہ کل تو رائے بریلی جانا ہے، ملنا ہوگا نہین اب پرسون شام کو ملاقات ہوگی، موت سر پر کھڑی خندہ زن تھی، کہ یہ ملاقات اب پرسون شام کو نہین قیامت کے دن ہوگی، دل کی حسرتین دل ہی مین رہ گئین اور رامائن کی بقیہ نظمون کے مسودے کے پرچے اور پرزے، باوجود سخت تلاش کے کہین دستیاب نہ ہوئے،

شبہہ نہین کہ پچھلی ایک نسل مین نہ صرف زمانہ نے بلکہ ہمارے ملک اور ہماری قوم نے بھی ترقی کی کئی منزلین طے کی ہین، جس کو ہم نیا دور کہتے تھے وہ اب پرانا پڑتا جاتا ہے، ترقی کے معنی اس طرح بدل گئے ہین کہ اصلاح تنزل اور انقلاب ترقی کا مترادف ہے، ہماری علمی اور ادبی مجلسون مین بھی انقلاب ہی کا ڈنکا بجتا ہے اور صحیح ہے کہ یہی زندگی ہے، پھر بھی پچھلی نسل کے وہ لوگ جو ابھی باقی رہ گئے ہین، اور رفتار زمانہ کا پورا ساتھ نہین دے سکتے، ان کے دلون مین آج بھی

لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور کلچر کی یاد رہ رہ کر چٹکیاں لیتی ہے، غلط یا صحیح، پر انسانی فطرت یہی ہے، اسی لئے ریڈیو والوں نے جب چکبست کی یاد تازہ کرنے کو مجھ سے کہا تو میں بے تامل راضی ہو گیا، جن احباب کی اعلیٰ حوصلگی کے آگے یہ داستان پارینہ بے موقع و بے محل معلوم ہو وہ مجھے معاف کریں، تسکین کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دور گذر تو گیا پر اس کی یادیں دہرانے کے لائق ہیں، بھلانے کی چیز نہیں، ہاں صاحبانِ کمال ایک ایک کر کے اٹھ گئے، کوئی آگے گیا کوئی پیچھے، وہ محفل سونی ہو گئی، اب جو ہے

> داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
> ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

تلخیص و تبصرہ

شیر شاہ کی سیکولر حکومت

(۲)

ڈاک چوکی | شیر شاہ کی سرائے میں ڈاک چوکی کا اسٹیشن بھی ہوتا تھا، اس نے ڈاک لانے اور لیجانے کا بہت اچھا انتظام کیا تھا، اُس سے اس کا ہاتھ اس کی پوری سلطنت کی نبض پر رہتا تھا، ہر سرائے میں ڈاک چوکی کے دو گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے، جس سرعت کے ساتھ ڈاک ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی تھی، اس کا ذکر تمام مورخوں نے کیا ہے، شیر شاہ کو نیلاب اور بنگال کے آخری حدود تک سے روزانہ خبریں ملتی رہتی تھیں، اس کے پاس خبریں پہونچنے کے دو ذریعے تھے، ایک تو سرکاری حکام برابر خبریں بھیجتے رہتے تھے، دوسرے خفیہ خبر رسانی کا بھی انتظام تھا، خفیہ خبر رسان تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے، جو برابر خبریں ڈاک چوکی کے ذریعہ بھیجا کرتے تھے، خبر رسانی کا محکمہ عہدِ مغلیہ میں داروغہ ڈاک چوکی ہی کی نگرانی میں کر دیا گیا تھا، شیر شاہ کے خفیہ خبر رسان مملکت کے باہر کی مفید خبریں بھی اس کے پاس بھیجا کرتے تھے،

پولیس | شیر شاہ کا محکمۂ پولیس سادہ لیکن بہت بہتر تھا، سرکار کا شقدار امن و امان کا نگہبان ہوتا تھا، اور اس کے ماتحت شقدار یہی فرائض پرگنوں میں انجام دیتے تھے، شیر شاہ نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ اگر چوری یا ڈکیتی کے مجرم پکڑے نہ جا سکتے، تو آس پاس کے مقدم گرفتار کرلئے جاتے، اگر مقدم مجرموں کا پتہ چلا لیتے، تو جس گاؤں میں یہ مجرم پکڑے جاتے وہاں کے مقدم کو اس گاؤں

کے نقصان کی تلافی کرنی پڑتی، جہان مجرم نے جرم کا ارتکاب کیا تھا، چورون اور ڈاکوؤن کو قانون کے مطابق سزا دی جاتی، اگر کسی قاتل کا پتہ نہ چلتا تو عامل مقدم کو گرفتار کر لیتے، اور وہ اس وقت تک قید مین رہتے، جب تک قاتل گرفتار نہ کر لیا جاتا، قاتل کی سزا موت تھی، اور اگر مقدم قاتل کا پتہ نہ چلاتے، تو پھر ان کو بھی موت کی سزا دیجاتی،

یہ نظام اس عہد کے لئے اتنا موزون ثابت ہوا کہ عہد مغلیہ کا مورخ نظام الدین لکھتا ہے کہ، شاہراہون کے امن کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی مسافر اشرفیون کی تھیلی پاس رکھ کر کسی سنسان جگہ پر سوجاتا تو کسی کو اس کی حفاظت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ شیر شاہ کے عہد مین مسافرون کو سفر مین کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا تھا، اور وہ جنگل مین بھی بلاخوف ٹھہر جاتے، رات کو ہر جگہ خواہ یہ آبادی مین ہوتی، یا ویرانے مین قیام کرتے، میدان مین اپنا مال واسباب رکھکر اور خچرون کو چرنے کے لئے چھوڑ کر گھر کی طرح چین کی نیند سوجاتے، اس علاقہ کا زمیندار ان مسافرون کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہوتا تھا، اگر کسی مسافر کو کوئی تکلیف پہنچتی، تو زمیندار گرفتار کر لیا جاتا، امن کا حال یہ تھا کہ اگر ایک بوڑھی عورت اپنے سر پر سونے کے زیورات کی گٹھری رکھ کر تنہا سفر پہ روانہ ہوجاتی تو شیر شاہ کے سزا کے خوف سے کوئی چور یا ڈاکو اس کے پاس پھٹکنے کی ہمت نہ کرتا،

شیر شاہ کا کردار

شیر شاہ کی پالیسی صرف فولاد اور خون ہی پر مبنی نہ تھی، بلکہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آتا تھا، سرکشون کے لئے تو بلاشبہ سخت تھا، لیکن کمزورون اور غریبون کے لئے لطف ومحبت کا پیکر تھا، اس نے فقراء کے لنگر خانون کے لئے پانچ سو تولہ سونا مقرر کیا تھا، ضرورتمندون کی حاجت رفع کرنے مین دن رات لگا رہتا، ہر گاؤن اور شہر کے اندھون اور اپاہجون کی کفالت حکومت کے ذمہ تھی، وہ جہان جاتا، تو اس کے حکم کے مطابق وہان کا کوئی شخص بھوکا نہ رہنے پاتا، شاہی باورچیخانہ مین جو بھی آجاتا، کھا کر جاتا، اس باورچی خانہ مین کئی ہزار آدمی روزانہ کھانا کھاتے تھے، اس کے کیمپ مین

بھوکون اور غریبون کو برابر کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ صرف مسلمان غرباہی کا خیال کرتا تھا، اس زمانہ مین تو مسلمان بہت تھوڑے تھے، امدادی باورچی خانے ہندوؤن اور مسلمانون کے لئے علٰحدہ علٰحدہ ہوتے تھے، کیونکہ شیر شاہ یہ جانتا تھا کہ ایک ہندو فاقہ سے مرجانا گوارا کرے گا، لیکن ایک مسلمان کے ہاتھ سے ایک لقمہ بھی کھانا پسند نہ کرے گا،

شیر شاہ نے اپنے لئے سلطان العدل کا لقب پسند کیا تھا، اوس نے کل ساڑھے پانچ سال تک حکومت کی لیکن اس مدت مین کبھی عدل وانصاف کی راہ سے بال برابر بھی نہین ہٹا، مظلومون کی پوری دادرسی کرتا تھا، اور ظالمون کے ساتھ ذرا بھی رعایت نہین کرتا تھا، خواہ اس کے محبوب لڑکے یا شفیق اقربا یا ممتاز امراہی کیون نہ ہوتے، ان کو سزا دینے مین نہ نرمی برتتا تھا، اور نہ تاخیر کرتا تھا، خلاصۃ التواریخ مین اس کی عدل پروری کا یہ عجیب وغریب واقعہ ہے کہ آگرہ کے ایک شہری کی بیوی غسل کر رہی تھی، شہزادہ عادل خان نے پان کا ایک بیڑا پھینک کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا، عورت کو یہ حرکت ناگوار ہوئی، اس کے شوہر نے شیر شاہ سے فریاد کی، اُس نے شہزادہ کو طلب کر کے یہ فیصلہ دیا کہ وہ شہری بھی شہزادہ کی بیوی پر پان کا ایک بیڑا اس وقت پھینکے، جب وہ کپڑے اتار کر غسل کرنے کے لئے جارہی ہو، اس فیصلہ کو سُن کر ہر شخص متحیر رہ گیا، کچھ لوگون نے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کی التجا کی لیکن شیر شاہ نے کسی کی نہین سُنی، اور کہا کہ اُس کے نزدیک شہزادہ اور ادنیٰ دہقانی دونون برابر ہین، اور وہ خود رعایا کی حفاظت کے لئے ہے، اس لئے شہزادہ کو کسی کو تکلیف پہنچانے کا حق نہین ہے، ممکن ہے کہ یہ واقعہ بعینہٖ صحیح نہ ہو، لیکن ڈیڑھ سو برس بعد تک بھی لوگون کی زبانون پر رہا،

شیر شاہ اپنے نظم ونسق مین محض اس لئے کامیاب تھا کہ قصور کرنے والون کو سخت سے سخت سزائین دیتا تھا،

شیر شاہ نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا تھا جس سے ہندوستانی

قومیت کو ترقی کرنے لئے نہایت مناسب فضا مل گئی، مسٹر ڈبلیو، کروک کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہین ہوسکتا کہ شیرشاہ پہلا حکمران ہے، جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، اور یہ کام اوس نے اپنے عہد کے اس سیاسی اصول سے ہٹ کر انجام دیا، کہ سیاسی اتحاد بغیر مذہبی یکسانیت کے قائم نہین ہوسکتا، اُس نے یہ محسوس کیا کہ سارے ہندوؤن سے مذہب اسلام قبول کرانا محض حماقت ہے، چنانچہ اُس نے نہ ہندو مذہب کے پیروؤن پر کسی قسم کی پابندی عائد کی، اور نہ اُن کے ساتھ ذلت آمیز رویہ اختیار کیا، اس کی مذہبی پالیسی مین بڑا اعتدال رہا، اُس نے کسی مندر کو منہدم کیا، اور نہ کسی بُت کو توڑا، اس کی مذہبی پالیسی مین صرف رواداری ہی نہین تھی، بلکہ غیر جانبداری بھی تھی، تبلیغ اسلام کے سلسلہ مین جو باتین حکومت کی طرف سے کی جاتی تھین، ان سب کو اُس نے رکوا دیا، اگرچہ اُس نے جزیہ لینا بند نہین کیا، لیکن کم ازکم اس اسپرٹ مین اس کو عائد نہین کیا گیا، جس کی تلقین قاضی مغیث الدین نے سلطان علاء الدین خلجی کے عہد مین کی تھی، شیرشاہ نے ہندو مذہب کا احترام ہر چیز مین ملحوظ رکھا، چنانچہ ہندوؤن کے لئے ہر سرائے مین علحدہ انتظام تھا،

شیرشاہ نے اپنی حکومت مین سیکولر اسپرٹ پیدا کی، اگرچہ وہ مذہبی راسخ العقیدگی مین کسی دوسرے مسلمان سے کم نہ تھا، لیکن اس نے اس کا اثر اپنی حکومت کی پالیسی مین ظاہر ہونے نہین دیا، وہ مسجد کے ان اماموں اور علماء سے بڑی سختی سے پیش آتا، جو حکومت کو دھوکا دیتے تھے، وہ تو اسلام کے ایسے قوانین تک مین ردوبدل کردیتا تھا[1] جو اس کی ہندو رعایا کے لئے سخت ہوتے تھے، اس نے جو قوانین بنائے اُن کا خود بھی سختی سے پابند رہا، اور دوسرون کو بھی پابند بنایا، اس نے اپنی سلطنت کے ہر حصہ مین اس غرض سے جاسوس مقرر کر رکھے تھے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ان قوانین کی پابندی ہوتی ہے یا نہین، افغان عادۃً قانون شکن ہوتے ہین لیکن شیرشاہ ان پر غالب آیا، ان مین جو شخص کسی

[1] معارف: اس سے مراد اصول اسلام نہین بلکہ فقہی جزئیات ہین، جن مین حالات کے مطابق تبدیلی ہوسکتی ہے،

قانون کی پابندی نہ کرتا، اس کو یا جسمانی سزا ملتی، یا اپنے عہدہ سے وہ برطرف کردیا جاتا بلکہ اس کو موت تک کی سزا دینے مین بھی دریغ نہ کرتا، جس سے افغانون کی آپس مین جھگڑنے کی بُری عادتین جاتی رہین

شیرشاہ نے اپنی حکومت کے فروغ دینے مین ریاست کے ہر طبقہ کے لوگون سے فائدہ اٹھایا، ہندوستان کے کسی فرقہ کے لوگون کو حکومت سے علحدہ نہین رہنے دیا، بعض ایسے فرقے تھے، جو حکومت سے غیر مطمئن یا کسی اشتعال کے باعث حکومت سے علحدہ رہنا چاہتے تھے، لیکن شیرشاہ نے ان سب کو اپنی طرف مائل کرلیا، اوس نے کسی قسم کا نسلی امتیاز روا نہین رکھا، ترکون اور خلجیون کو آزادانہ طور پر ملازمتون مین لیا، وہ لوگون کی تنگ نظری کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور ان کو وسیع النظر بنانے کی کوشش کرتا تھا اس کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ اس کے ہم نسل اپنے کو صرف ارکان حکومت سمجھین، اس کی کوشش یہی رہی کہ سب لوگ ماضی کو بھول جائین، اور ایسی ہندوستانی قومیت کے لئے راستہ ہموار کرین جس سے مشترکہ مفاد اور مشترکہ جذبات وابستہ ہون،

شیرشاہ بحیثیت معمار قوم

شیرشاہ پہلا حکمران ہے، جس نے مختلف مذاہب کے پیروؤن کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی، یہ امتیاز اکبر کو دیا جاتا ہے، اور شیرشاہ کے لئے یہ دعویٰ فضول سا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بظاہر اُس نے جزیہ لینا بند نہین کیا، گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کے لئے کوئی قانون نہین بنایا، سنسکرت زبان کی کوئی ایسی سرپرستی نہین کی، جس سے ہندو اور مسلمان دونون مین کلچرل اتحاد اور علمی یگانگت پیدا ہوتی، اُس نے ہندو مسلمان مین شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنے کی کوشش نہین کی، اور یہ تمام باتین اکبر کی جانب منسوب ہین، لیکن شیرشاہ صحیح معنون مین ایک مدبر تھا، اُس نے علاؤ الدین کے چراغ کے ذریعہ ایک رات مین کوئی ہوائی قلعہ تیار کرنے کی سعی نہین کی، بلکہ ایک ایسا جاندار اور عادلانہ نظام حکومت قائم کیا، جس سے ہندوؤن مین سیاسی اور اقتصادی خوشحالی خود بخود پیدا ہوگئی، اُس نے ہندو و مسلمانون کو متحد

رہنے پر آمادہ کیا، اس طرح اُس نے ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈالی، اور اس کے ابتدائی دور کے لئے جتنی چیزیں ضروری تھیں، ان سب کو عمل مین لانے کی کوشش کی، اس نے ہندوستانی قومیت کے لئے زمین ہموار کر کے اس مین بیج بھی ڈال دیا، لیکن افسوس ہے کہ زیادہ دنون تک زندہ نہین رہا کہ اپنی ان کوششون کو بار آور دیکھتا، اوس نے جو کچھ کیا، اگر اس سے زیادہ کرنے کی کوشش کرتا، تو ناکام رہتا، اگر وہ جزیہ لینا بند کر دیتا، یا ذبیحہ گاے رکوا دیتا، تو اس کا نتیجہ سے انتہائی ناعاقبت اندیشی ہوتی، اور اس قسم کا اقدام ریاست کے لئے مضر ہوتا، لیکن اس کے باوجود ہندو مسلمان کے تعلقات خوشگوار تھے، اس کے مقابلہ مین اکبر نے اپنے تخیلات کا برا استعمال کیا، اگر وہ غلط قدم نہ اٹھاتا، تو ہندوستان کی قومیت سترہوین صدی عیسوی ہی مین پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی، اگر اکبر نے جزیہ لینا بند کر دیا ہوتا، یا ذبیحہ گاو رکوا دیا ہوتا، یا اپنے نظام حکومت مین ہندوؤن کو ایک حد تک شریک کیا ہوتا یا سنسکرت زبان کی سرپرستی مین لگا رہتا، تو یہان تک کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن اوس نے ہندوؤن کے فلسفہ اور مذہب کے ساتھ شغف کا اظہار کرنا شروع کیا، جو تدبر کے سراسر خلاف تھا، اگر اس شغف کا اظہار اس نے نہ کیا ہوتا، تو بلا شبہہ وہ دنیا کا بہت بڑا مدبر اور معمار قوم ہوتا، لیکن اُس کے عجیب و غریب خیالات نے اس کو ایک نئے مذہب کا پیغمبر بنا دیا، اور ساتھ ہی ساتھ وہ رعایا کا سیاسی حکمران بھی رہا، اور یہی خیالات اس کی اسکیم کی تباہی کا باعث بنے، اُس نے کوئی متحدہ قوم نہین بنائی، بلکہ اس کی اسکیم سے ایسے چند مکار مسلمان اور غلامانہ ذہنیت کے ہندو ضرور پیدا ہوئے جو اس کو خوش کرنے کے لئے اللہ اوپنشد لکھا کرتے تھے، پھر اُن کی اولاد مین بھی کچھ ایسے افراد ہوئے، جو دہلی کے بادشاہ کا درشن کئے بغیر صبح کو پانی نہ پیتے تھے، خواہ یہ بادشاہ اورنگ زیب ہی کیون نہ ہوتا، اکبر نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی، اس کو خواہ مخواہ رسوا کیا، جس کے لئے تاریخ اس کو معاف نہین

کر سکتی، اُس نے جو کچھ کیا، ریاست کے مفاد کے لئے نہین، بلکہ ایک وہم کو پورا کرنے کے لئے کیا، اس کی پالیسی کی وجہ سے ہندو اور مسلمان تخت کو اتحاد و اتفاق کا مرکز سمجھنے مین بالکل قاصر رہے، ہندو تو اُس کی جانب مائل ہوئے، لیکن مسلمانون کی رغبت جاتی رہی، اکبر کا اسلام سے انحراف اس کی غیر معمولی ذہانت کا اچھا نمونہ نہ تھا، اس کو اپنی نجی زندگی مین سچا مسلمان ہونا چاہئے تھا، اگر وہ واقعی ہندو مسلمان کے تعلقات کی خوشگواری اور پائداری کا خواہان تھا، تو اسے اپنے ہم مذہبون کو ہندوؤن کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہئے تھا، لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ نہین ہو سکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بن جاتا، تو مسلمان اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، پھر وہ جو کچھ کہتا اس کو ماننے مین اُن کو تامل نہ ہوتا، اُس نے ہندوؤن کی حمایت مین جو قوانین بنائے اس مین مسلمانون کو نیت کا اخلاص نظر نہین آیا، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے، اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ وہ اسلام کی فلاح اسی مین سمجھنے لگے، کہ گائے کا گوشت کھائین، اور ہندوؤن کی ہر چیز سے نفرت کرین، یہین سے ہندوستانی قومیت کا خاتمہ ہو گیا، اگر اکبر کا جانشین دارا ہوتا، تو خاندان بابری ہندوستان سے ایک بار پھر دربدر کر دیا جاتا، اکبر کے مرنے کے بعد اس کی پالیسی کا ردّ عمل بالآخر اورنگزیب کی صورت مین ظاہر ہوا،

اکبر کے تمام کارنامون کو سامنے رکھا جائے تو بیشک وہ شیرشاہ سے بہتر حکمران ثابت ہوگا، لیکن شیرشاہ اپنے تدبر، حکمرانی کی صلاحیت، حکومت کے کامون کی طرف غیر معمولی توجہ، محنت و جانفشانی، بیدار مغزی، اخلاق کی بلندی، انصاف پروری، اور سپہگری وغیرہ مین اکبر سے بہتر تھا، اکبر کی ذہانت مین ہمہ گیریت اور رفعت ضرور تھی اور اس نے خود اتحاد کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ وہ تمام حکمرانون سے بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کی غیر معمولی ذہانت مین سکندر اعظم کی ذہانت جھلک تھی جس نے مشرق اور مغرب کو ملانے کا ایک خواب دیکھا تھا، اکبر کی سرپرستی مین ہندوستانی

آرٹ اور تاریخی لٹریچر پیدا ہوا، وہ ہندوؤن کے ہندوستان کی سچی اسپرٹ کا مجسمہ تھا، اس کا شمار اشوک اور ہرش وردھن کے جانشینون مین ہو سکتا ہے، اس کے ان تصورات کی وجہ سے اوس کی عظمت ضرور ہے،

لیکن ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ مین شیر شاہ نے ایک نئے ہندوستان کی بنیاد ڈالی، یعنی ایک ایسا ہندوستان بنانے کی کوشش کی، جو ہندو اور مسلمان دونون کا ہو، ہندو اکبر کا احترام کرتے ہین مسلمان اورنگزیب سے عقیدت ہے، لیکن موجودہ دور کی نسلین ان دونون مین سے کسی کو بھی احترام و عقیدت کی نگاہ سے نہین دیکھ سکتین، کیونکہ اُن مین سے ایک نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی، اور دوسرے نے ہندوؤن کے ساتھ، ان دونون کی ناکامی ہندوستان کے مدبرین کے لئے ایک سبق ہے، یہ صرف شیر شاہ ہی کا عہد حکومت ہے، جس کی تاریخ ہندو اور مسلمان دونون شرم و ندامت محسوس کئے بغیر پڑھ سکتے ہین، اس کے عہد مین اسلام کی عظمت بھی برقرار رہی، اور ہندو مذہب پر بھی آنچ نہ آنے پائی، وہ اپنے عہد کے لئے تو موزون نہ تھا، لیکن آیندہ نسلون کے لئے ایک سبق چھوڑ گیا،

"ص ع"

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا ترجمہ جس مین مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر علماے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانون کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ مین انکی جہالت اور وحشت و بربریت اور اس دور ترقی مین انکی پُر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین مسلمانون کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آگیا ہے، (از شاہ معین الدین احمد ندوی) **منیجر**

ادبیات

از

جناب شفیق صدیقی جونپوری

غزل

گونجے ہزار تیری صدا روزگار مین — اک دن یہ جذب ہوگی ہماری پکار مین

اے وقت انقلاب کی دھمکی نہ دے مجھو — ہے گردشِ زمانہ میرے اختیار مین

اس وقت پوچھئے نہ تباہی بہار کی — جب آچکا ہو سارا چمن اختیار مین

اس ہمتِ بلند کی پروا ز الامان — جس نے جنم لیا ہو دلِ خاکسار مین

اگلی تجلیون کو بھلایا نہ جا سکا — لاکھون نگاہین آج بھی ہین انتظار مین

بدلے ہزار زاویے لیکن میری خودی — محفوظ ہے ابھی نگہ اعتبار مین

جب مین نہ تھا تو لوگ چمن جانتے نہ تھے — اب تو رنگا ہوا ہے زمانہ بہار مین

نظرون سے کتنی چاندنی راتین گذر گئین — اک خاص روشنی تھی شبِ انتظار مین

لے دے کے آج میری ترانون کی آزوان — اک عندلیب ہے چمنِ روزگار مین

دیکھے گی کائنات کبوتر کا انتقام — شاہین کے پر ہوا پہ اڑین گے غبار مین

اے چاند بستیون مین اجالے بہت ہوئے
آجا کبھی شفیق کے اُجڑے دیار مین

غزل

از

جناب نکہت شاہجہانپوری

زندگی اک ساغرِ گلفام ہے — بادۂ الفت ہی دورِ جام ہے

حسن کی سرمستیون سے کام ہے — صبح اپنی ہے نہ اپنی شام ہے

دل کی دنیا الجھنون کی آرزو — عشق مین آرام ہی آرام ہے

ہر نفس ہر لحظہ جوشِ انبساط — زندگی کس شوخ کا پیغام ہے

کامیابی بن گئین ناکامیان — ہان مقامِ دل اسی کا نام ہے

عقل کو بھی چھیڑتا چل اے جنون — پختہ مغزی اک خیالِ خام ہے

اُن کے رُخ پر جو بکھر کر رہ گئی — وہ نگاہِ شوق کب ناکام ہے

اے مسافر یہ تری منزل کہان — تو اسیر گردشِ ایام ہے

پختہ مغزانِ جنوں سے پوچھ لے — عقل آرائی خیالِ خام ہے

اُن کے جلوے کب رہے زیرِ نقاب — شوقِ نظارہ ابھی کچھ خام ہے

بتکدے سے تجھکو نکہت کیا غرض

تیری ہستی مظہرِ اسلام ہے

مطبوعات جدیدہ

بریدِ فرنگ از جناب مولانا سید سلیمان ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۱۳ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ:۔ مکتبۃ الشرق مسجد باب الاسلام آرام باغ کراچی،

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے نتیجہ مین ترکی حکومت کے خاتمہ اور عرب ملکون کی تقسیم و تجزیہ کے بعد اُن کی آزادی اور بحالی کی کوشش کے لئے ۱۹۲۰ء مین خلافت کمیٹی کی جانب سے مولانا محمد علی مرحوم کی قیادت مین جو وفد لندن گیا تھا اس کے ایک رکن حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ بھی تھے، اس سفر مین موصوف نے مولانا عبد الباری مرحوم فرنگی محلی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا مسعود علی صاحب ندوی اور اپنے بعض اعزہ کو جو خطوط لکھے تھے، بریدِ فرنگ انہی کا مجموعہ ہے، یہ خطوط ان کوششون اور کارگزاریون کی روداد پر مشتمل ہین، جو وفد خلافت نے حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ فرانس کے ارکان سے مل کر انجام دی تھین، اس سفر مین موصوف کو پیرس، سوئزرلینڈ اور اٹلی بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا، اور ان ملکون کے اربابِ سیاست، اصحابِ علم اور دوسری جماعتون سے ملنے کا موقع ملا، اسلامی ملکون کے ان اکابر سے جو یورپ مین مقیم تھے، ملاقاتین ہوئین اور مختلف مسائل پر ان سے تبادلۂ خیالات ہوا، لندن کی تعلیم گاہون، اور وہان کے مشرقی کتب خانون کو دیکھنے اور یورپی تمدن کے مظاہر اور اس کی سیاست کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، اس کے علاوہ سیر و سیاحت مین اور جو دلچسپ مشاہدات و تجربات ہوئے، ان خطوط مین اُن کا بھی ذکر ہے، اس لئے یہ مختلف النوع سیاسی، علمی اور تمدنی معلومات کا مجموعہ ہین، اور اُن سے اس زمانہ کی دنیائے اسلام کی حالت اور یورپ کی سیاست کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان، مدبر کاتب خطوط کی نظر کتنی گہری تھی، انہون نے

آج سے بتیس سال پہلے جو پیشنگوئیاں کی تھین، ان مین سے بہت سی حرف بحرف پوری ہوئین مجموعہ کے شروع مین موصوف کے قلم سے ہندوستان کے مسلمانون کی اس زمانہ کی سیاست پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے، اس لئے یہ مجموعہ محض ایک داستان ماضی نہین، بلکہ مختلف حیثیتون سے آج بھی اصحاب علم و نظر کے مطالعہ کے لائق ہے،

کشکول از جناب چودھری محمد علی صاحب ردولوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۳۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت تحریر نہین، مصنف سے ردولی ضلع بارہ بنکی سے ملے گی،

مصنف ایک مشہور صاحب طرز اور شگفتہ نگار ادیب ہین، لطف زبان کے ساتھ اس طرز پر لکھنے والے اب لکھنؤ مین بھی نہ ملین گے، کشکول اُن کے ادبی مضامین کا اسم باسمی مجموعہ ہے، اس مین چند افسانے ہین، کچھ سیرتون کے خاکے بعض تراجم اور مختلف چھوٹے چھوٹے ادبی مضامین اور ادبی یادداشتین ہین، یہ میدان چودھری صاحب کا اصلی جولانگاہ ہے اس لئے اس مین اُن کے قلم کے جوہر پوری طرح نمایان ہین، وہ اودھ کے قصبات کی پرانی تہذیب اور اس آسودہ حال سوسائٹی کی یادگار ہین جس کا مقصد بے غمی و بے فکری اور آسودگی و طمانیت کی سہانی چھاؤن مین لطف و تفریح کی مرنجان مرنج زندگی بسر کرنا اور زندگی کی مسرتون سے لطف اندوز ہونا تھا، اس زندگی مین عیوب و نقائص کے باوجود کچھ خوبیان اور وضعداریان بھی تھین، چودھری صاحب اسی زندگی کے ترجمان ہین، چنانچہ اُن کے بیشتر افسانون مین اسی خوشنما تہذیب اور اسی نرم روز زندگی کے عیب و ہنر کی عکاسی ہے اگر مصنف زندگی کے محض سرسری تماشائی نہین ہین، اُن کا مشاہدہ قوی اور اُن کی نگاہ دقیقہ رس ہے، اور انسانی زندگی کے مختلف گوشون اور پہلوؤن پر پہنچتی ہے، نفسیات مین بھی اُن کو دخل ہے، اس لئے ان افسانون اور خاکون مین تفریح اور تفنن کے ساتھ زندگی کے حقائق اور حکیمانہ باتین بھی ملتی ہین اور انسانی فطرت کی بوقلمونی کا بھی پورا مشاہدہ ہوتا ہے، اور مصنف کے قلم نے بڑی خوبی سے ان کی مصوری

کی ہے، اگر کہین کہین قلم مین شوخی اور بے باکی زیادہ آگئی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے بغیر کردار کی مصوری ناقص رہتی، تراجم کا حصہ بھی دلچسپ اور کسی نہ کسی خصوصیت کا حامل ہے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب نہایت دلچسپ ہے، مصنف کے انداز بیان نے اس مین اور دلکشی پیدا کر دی ہے، اور اس سے خود مصنف کے ذوق و رجحان کا بھی پورا اندازہ ہو جاتا ہے،

کوثر و تسنیم از جناب الم مظفر نگری تقطیع اوسط ضخامت ۲۷۲ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت، بہتر، قیمت مجلد للعہ پتہ: ناظم دار الاشاعت، فردوس منزل مظفر نگر،

کوثر و تسنیم مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، انھون نے اگرچہ شاعرون کے ذریعہ شہرت حاصل نہین کی لیکن وہ صاحب استعداد، اور قادر الکلام سخنور ہین، ان کا کلام فنی اور ادبی حیثیت سے نہایت پختہ اور اکثر رائج الوقت شعراء کے کلام سے بہتر ہے، وہ صاحب فکر نظم نگار بھی ہین اور خوشنوا غزل سرا بھی، اور دونون مین ان کو یکسان قدرت حاصل ہے، اُن کی بیشتر نظمین قومی و ملی جذبات اور حکیمانہ و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہین، مگر شاعرانہ لطافت کا دامن کہین ہاتھ سے نہین چھوٹا ہے، غزلین بھی ستھری اور پاکیزہ ہین، فارسی کی بھی چند نظمیں ہین، ان مین قند پارسی کا لطف ہے، فارسی کا ایسا صحیح مذاق رکھنے والے اس زمانہ مین کم ملین گے، تاہم اگر عیب چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے، تو کسی شاعر کا کلام بھی خامیون اور فروگذاشتون سے پاک نہین نکل سکتا، جس سے یہ مجموعہ بھی مستثنیٰ نہین ہے لیکن وہ آج کل کے شعراء کی عامۃ الورود غلطیون سے پاک اور اپنے ظاہری و معنوی محاسن کے لحاظ سے اسم بامسمّیٰ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

اختلافی مسائل مین اعتدال کی راہ } مترجمہ جناب مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۸ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۲ر، پتہ مکتبہ جماعت اسلامی ریاست رامپور،

یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے رسالہ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف کا اردو ترجمہ ہے، اس مین عہد صحابہ سے لیکر چوتھی صدی ہجری یعنی تقلید شخصی مین شدت پیدا ہونے کے زمانہ تک دینی مسائل مین فقہی اختلاف، اور اس کے اسباب و وجوہ پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس سلسلہ مین استنباط مسائل مین ہر دور کے اکابر محدثین، فقہاء و مجتہدین، اصحاب رائے و اصحاب ظاہر کے مسلک، اُن کے اصول و طریقے، اُن کے اجتہادات کی نوعیت، کتب حدیث و فقہ کی تدوین، فقہ کے مختلف مذاہب، اجتہاد و تقلید وغیرہ، اختلاف مذاہب کی پوری تاریخ آگئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ مین دینی مسائل مین اختلاف کی کیا شکل تھی، اور رفتہ رفتہ اس مین کس طرح شدت آتی گئی، اور اس مین اعتدال کی صحیح راہ کیا ہے، شاہ صاحب کی دوسری کتابون کی طرح یہ کتاب بھی اس کی وسعت و دقت نظر، نکتہ سنجی و دقیقہ رسی، اور حکیمانہ مسلک کا نمونہ ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

مقدمہ قادیانی: از جناب پروفیسر الیاس برنی صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۷۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت عہ پتہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور،

قادیانی مذہب کی تردید مین پروفیسر الیاس برنی کی مشہور کتاب "قادیانی مذہب" تاریخ مناظرہ مین اپنی نوعیت کی پہلی اور بے مثل کتاب ہے، جس مین خود مرزا صاحب اور انکے مذہب کے اکابر کی تصانیف اور تحریرون سے اس مذہب کی اصل حقیقت ظاہر کی گئی ہے، اور اس کے خلاف اتنا مواد جمع کر دیا گیا ہے کہ خود اپنی جانب سے اس کی تردید و ابطال مین کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہین رہ جاتی، مگر یہ کتاب بڑی ضخیم ہے، جس کے مطالعہ کا موقع ہر شخص کو نہین مل سکتا، اس لئے مصنف نے اس کتاب کا مقدمہ جو کہ خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہو، الگ شائع کر دیا ہے، اس مین اصل کتاب کی تمام بنیادی باتین آگئی ہین اسلئے تنہا یہ مقدمہ قادیانی مذہب کی حقیقت سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہے، "م"